فیض احمد فیض بیروت میں
جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ
یادداشتیں
تسلیم الٰہی زلفی
اکادمی ادبیات پاکستان

فیض احمد فیض بیروت میں

جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ

یاد داشتیں

تسلیم الٰہی زلفی
(کینیڈا)

اکادمی ادبیات پاکستان
اسلام آباد، پاکستان

کتاب	فیض احمد فیض بیروت میں جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ
نگران	فخر زمان
تدوین وطباعت	طارق شاہد
مصنف	تسلیم الٰہی زلفی
پہلی اشاعت	فروری 2011
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	ماریا پرنٹرز، اسلام آباد
قیمت :(پاکستان میں)	-/225روپے
(بیرون ملک) :	5ڈالر

ISBN:978-969-472-264-1

Faiz Ahmed Faiz in Beirut

Reminiscence of

Tasleem Elahi Zulfi

(Canada)

Publised by

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

پیش نامہ

فیض صاحب کی زندگی کے چار اہم سال

فیض احمد فیض کے فن و شخصیت، زندگی کے حوالے سے اب تک درجنوں کتابیں اور سیکڑوں مضامین و مقالے لکھے جانے کے باوجود، اُن کی زندگی میں قیامِ بیروت کے وہ چار اہم سال ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئے تھے۔ اِس کتاب کے فاضل مصنف تسلیم الٰہی زلفی نے نہایت ذمّے داری اور اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قلم بند کیے ہیں۔

زلفی صاحب نے بیروت میں اپنے عرصۂ قیام کے دوران، فیض صاحب کی غریب الوطنی، تنہائی اور فکری تلاطم کے نہایت ہی اہم چار سالہ دور کی نایاب یادداشتیں لکھ کر اُن کی زندگی کی کتاب کو مکمل کر دیا ہے۔ ''فیض احمد فیض بیروت میں'' سے آنے والی نسلیں فیض احمد فیض کے ۷۷ سالہ عرصۂ حیات میں بیروت میں قیام کے چار سال سے آگاہی حاصل کر سکیں گی۔

کینیڈا میں آباد، تسلیم الٰہی زلفی دنیائے اردو ادب کے نامور اسکالر ہیں، پچاس سالہ ادبی سفر کے عرصے میں اب تک ان کی چودہ گرانقدر تصنیفات منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ کینیڈا میں سرکاری و ادبی اداروں کی سطح پر اور امریکہ، برطانیہ، پاکستان، ہندوستان اور شرقِ اوسط میں علمی و ادبی اداروں کی جانب سے انہیں متعدد اعترافی اسناد، وثیقوں، لیش ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ خود فیض صاحب نے زلفی صاحب کے دوسرے شعری مجموعے ''دستاویز'' کے پیش لفظ میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیحد سراہا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری کی ہدایت پر سال 2011 کو فیض احمد فیض سال کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ ''فیض احمد فیض سال'' کے اہم موقع پر اکادمی ادبیات

پاکستان صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری کی خصوصی ہدایت پر اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت "فیض احمد فیض بیروت میں" جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ شائع کر رہی ہے۔ کتاب فیض احمد فیض کی بیروت میں شب و روز کے حوالے سے پہلی اور اہم کتاب ہے۔ اب تک فیض احمد فیض کی بیروت میں شب و روز کی تفصیلات سامنے نہیں آئی تھیں اس کتاب کے ذریعے ان کا یہ گوشہ بھی سامنے آئے گا۔ یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کی اہم کتابوں میں سے ایک ہوگی۔ اکادمی ادبیات پاکستان اس سے پہلے سہ ماہی "ادبیات" کا "فیض احمد فیض نمبر" اور اکادمی کے اشاعتی منصوبے "پاکستانی ادب کے معمار" کے تحت "فیض احمد فیض: شخصیت اور فن" شائع کر چکی ہے۔

فخر زمان

عرضِ مُصنّف

بیروت میں قیام کے دوران جہاں مجھے فیض صاحب کو قریب سے دیکھنے، ان کے صوفیانہ اور درویشانہ اوصاف سے اپنی عملی زندگی کو سنوارنے کا موقع ملا۔ وہاں میں نے ان کی دوسری جلا وطنی کے پڑاؤ کے عرصے میں، ان کی تنہائی اور فکری تلاطم کے نقوش، ان کے پورے وجود پر پر مرتسم ہوتے بھی دیکھے۔ ''فیض احمد فیض بیروت میں'' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں فیض صاحب کے بیروت میں گزارے چار برسوں کی مکمل داستان منصۂ شہود پر لائی گئی ہے:

☆ ۱۹۷۸ء میں جدّہ سعودی عربیہ سے میری بیروت آمد اور فیض صاحب سے رابطہ

☆ ''لوٹس میگزین'' کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض کی بھاری ذمہ داریاں

☆ محمود درویش، شرقِ اوسط کا فیض احمد فیض۔ دو بڑے شاعروں کی دوستی

☆ بیروت کے تاریخی مقامات میں فیض صاحب کی دلچسپی

☆ بیروت میں ''مرے دل، مرے مسافر'' کی شانِ نزول

☆ بیروت اور غزہ کی دبی دبی چیخیں اور درد کی کراہیں، فیض صاحب کی ''بیروتی'' شاعری میں

☆ ہم کہ بیروت میں فیض صاحب کے ''اکلوتے'' سخن فہم!

☆ بیروت میں پاکستانی سفارت خانے کی فیض صاحب سے پہلو تہی

☆ بیروت میں قیام کے دوران، فیض صاحب کے بیرونی ممالک کے دورے

☆ ہماری ''عربی ترجمانی'' میں فیض صاحب کی یاسر عرفات سے ملاقاتیں، عربی شعر و ادب پر گفتگو اور ''مرے دل، مرے مسافر'' کی شاعری کو ''ابو عمار'' کے نام کرنے کا فیصلہ

☆ عرب مغنّیہ فیروز کی آواز کا جادو فیض صاحب پر چل گیا۔ ہمارے ساتھ بیروت کنسرٹ میں شرکت

☆ بیروت میں فیضؔ صاحب کی قیام گاہ بمباری کی زد میں۔ بیگم ایلس فیض کی پاکستان واپسی
☆ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایفرو ایشیائی مصنفین کی تحریک اور اس کا ترجمان "لوٹس"
سب اپنے انجام کو پہنچے اور فیضؔ صاحب کی بیروت سے رخصت یہ اور بہت سی دوسری وہ
باتیں ہیں جو سیاق وسباق کے ساتھ بترتیب وار اس دستاویزی کتاب میں درج کی ہیں۔

فیضؔ صاحب پر اس کتاب کی اہمیت اور انفرادیت کے پیش نظر چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان فخر زمان صاحب نے اکادمی کے اشاعتی منصوبے کے تحت فیض احمد فیضؔ صدی کے موقع پر میری تصنیف "فیض احمد فیضؔ بیروت میں" کو جس سرگرمی اور سلیقے کے ساتھ زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے اس کے لیے میں "اکادمی ادبیات پاکستان" کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

تسلیم الٰہی زلفیؔ

(کینیڈا)

فیض احمد فیضؔ بیروت میں

جلاوطنی کا دوسرا پڑاوَ

جامعہ کراچی سے ایم۔اے کی ڈگری پانے کے بعد ہمارا اپنے والدین کے پاس سعودی عربیہ واپس جانے کا وقت آیا تو کراچی کے علمی اور ادبی حلقوں سے وابستگی اور اسی قبیل کی سرگرمیوں کے ناتے ،روزنامہ ''جنگ'' اور دیگر اخبارات میں ہماری تصویر کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ ہم پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سعودی عربیہ اپنے والدین کے پاس واپس جارہے ہیں اور وہاں سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیروت (لبنان) جائیں گے۔یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہمارے تعلیمی دور کا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِ افکار'' شائع ہو چکا تھا۔اب کا تو ہمیں معلوم نہیں البتہ اُس وقت، تعلیمی دور میں کسی کا شعری مجموعہ شائع ہونا پہلی اور نئی بات تھی! سعودی عربیہ واپسی کے بعد، وہاں ہم سعودی ائرلائنز سے وابستہ ہوگئے اور یوں کئی سال ملازمت کی گہما گہمی میں گزر گئے۔اسی دواران ہماری شادی بھی ہوگئی۔گویاازدواجی ذمہ داریاں بھی زندگی میں در آئیں۔آگے پڑھنے لکھنے کا معاملہ پسِ پشت پڑگیا اور امریکن یونیورسٹی بیروت سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کی ہماری خواہش سرد پڑگئی لیکن بالآخر حالات سازگار ہوگئے۔ہم نے ۱۹۷۸ء میں ''ہنگامی'' طور AUB میں اپنا رجسٹریشن کروایا اور بیروت چلے گئے۔

بیروت کی تعلیمی گہما گہمی اور مصروفیات کا ابتدائی عرصہ گذارنے کے بعد جب ذرا معمولاتِ روز وشب اعتدال پر آئے تو ایک غزل کی آمد ہوگئی۔اتنے دن کے بعد غزل کہہ کر دل کو ایک لطیف کیف وسُرور ملا اور اُسی کیفیت میں ہمیں فیضؔ صاحب کا خیال آیا۔تصور ہی تصور میں ہم نے

فیض صاحب کو دیکھا.... بیروت شہر..... ایفرو ایشیائی ادبی انجمن کے سہ ماہی مجلّے ''لوٹس'' کا دفتر، چیف ایڈیٹر کی کرسی، جلتا سگریٹ، چلتا قلم اور سوچتی آنکھیں۔ اُس وقت دن کے دس بجے تھے، ہم ٹیکسی سے ''لوٹس'' کے دفتر جا اترے۔ فیض صاحب کے تصور سے جو منظر ہمارے ذہن کے پردے پر ابھرا تھا۔ وہاں ان کے کمرے میں... انہیں اسی کی جیتی جاگتی تصویر کے روپ میں دیکھا!

کراچی میں اپنے تعلیمی دور میں کئی بار فیض صاحب کے عبداللہ ہارون کالج میں تقریری مقابلوں اور مشاعروں کے موقع پر ان سے ملاقات رہی اور کلام بھی سنانے کا موقع ملا لیکن اب کی ملاقات ایک نئے اور مختلف ماحول اور وقت میں ہوئی۔ بہر حال... فیض صاحب نے ہمیں یوں اچانک دیکھ کر حیرت اور مسرت کا اظہار فرمایا، بڑی شفقت سے بٹھایا، ہمارے انہیں Sir کہہ کر مخاطب کرنے پر کہنے لگے:

بھئی یہ کالج ہے نہ یونیورسٹی اور نہ ہی آپ کا تعلیمی دور۔

ہم نے عرض کیا: بجا فرمایا آپ نے بیشک یہ کراچی کا، کالج یا یونیورسٹی تو نہیں، البتہ ہمارا تعلیمی دور ہنوز جاری ہے اور پھر ہم نے انہیں بیروت میں اپنی موجودگی کی غرض وغایت سے آگاہ کیا۔

وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: بھئی اب یہاں ہو تو ملتے رہنا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

وہ کراچی کے بھی اہلِ ادب کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرتے رہے۔

پھر یکایک بولے: بھئی شاعری کیسی جارہی ہے؟

عرض کیا: بڑے دنوں بعد آج ہی کچھ شعر ہوئے ہیں، اور یہی شعر اِس وقت ہمیں آپ کے پاس لے آئے ہیں۔

اس پر وہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں مسکرائے اور فرمایا: تو ارشاد!۔

ہم ایک دم ٹپٹا سے گئے۔ اور عرض کی: ہم پہلے ہی آپ کا بہت وقت لے چکے ہیں، اگلی بار۔

ہماری بات کو کاٹتے ہوئے فیض صاحب نے فرمایا بھئی: ہم آپ کے شعر ضرور سنیں گے۔

تعمیلِ حکم کے طور پر ہم نے جیب سے پرچہ نکالا اور عرض کیا:

پہلے سینے کے اندھیرے میں چراغاں ٹھہرے
بعد اس کے مرے گھر میں کوئی مہماں ٹھہرے
ہے فصیل اونچی بہت، بند ہے دروازۂ شہر
اب کہاں قافلۂ خانہ بدوشاں ٹھہرے
اپنے اسباب میں، اک بے سر و سامانی تھی
شہر سے دور ہی، ہم بے سر و ساماں ٹھہرے
روح کے چاروں طرف جسم کے ہنگامے ہیں
ایسے پتھراؤ میں کیا، آئینۂ جاں ٹھہرے!
پھر کسی چاک گریباں سے ملے ہیں زلفی
اپنے ہاتھوں میں ذرا، اپنا گریباں ٹھہرے

فیض صاحب نے ہمارے اشعار نہایت توجہ سے سنے اور پسندیدگی کا اظہار فرما کر ہمت افزائی کی۔ بیروت میں فیض صاحب سے ہماری یہ پہلی ملاقات چار گھنٹوں پر محیط تھی۔ پتا ہی نہ چلا کہ کب دو بج گئے! ہم نے اب اجازت چاہی۔

کہنے لگے: آتے رہنا... اور ہاں آپ کی ابتدائی تعلیم تو عربی ہی میں ہوئی ہے۔ آپ کچھ فلسطینی شعراء کی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ کریں۔

پھر اپنی میز کی دراز سے نکال کر ہمیں محمود درویش کا ۱۹۷۰ء میں ''دارالادب بیروت'' سے شائع ہونے والا ۹۴صفحات پر مشتمل چوتھا شعری مجموعہ ''العصافیر تموت فی الجلیل'' (پرندے جلیل میں، مر رہے ہیں) دیا اور فرمایا: اب کی بار گھر آئیں اور کتاب پڑھ کر آئیں۔ ایک آدھ نظم کا پہلے نثری ترجمہ بھی کرلائیں۔ دیکھیں گے۔

یہاں بتاتے چلیں کہ شارع الحمراء ساحلِ سمندر پر ''لوٹس'' میگزین کے دفتر سے ملی ہوئی ایک عمارت کی چھٹی منزل پر دو کمروں کے فلیٹ میں فیض صاحب اور ان کی بیگم ایلس کی رہائش تھی۔

اس کی کھڑکیوں سے باہر دیکھیں تو ہر طرف سمندر ہی سمندر نظر آتا ہے۔کافی دوڑ دھوپ کے بعد فیضؔ صاحب کی پسند کا یہ فلیٹ ملا تھا۔

یہاں پہلے محمود درویش کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس طور مشرقِ وسطیٰ میں اُس وقت کی عمومی صورتِ حال کا احاطہ ہو سکے اور اس صورتِ حال سے فیضؔ صاحب کے فکری اور تخلیقی عمل پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا جائزہ بھی لیا جا سکے۔

۱۹۴۸ء میں جب محمود درویش ابھی چھ سال کے تھے کہ ان کے خاندان نے اپنے آبائی قصبہ البروہ سے لبنان کی جانب ہجرت کی۔ پھر محمود درویش اپنے خاندان کے ساتھ اسرائیل قائم ہونے کے بعد ہی واپس موجودہ اسرائیل میں آ گئے۔اسرائیل میں محمود درویش کو کبھی بھی اسرائیلی عرب کی حیثیت میں تسلیم نہیں کیا گیا۔۱۹۷۰ء میں جب وہ ماسکو گئے تو اُس وقت تک ان کی شاعری کے چار مجموعے شائع ہو چکے تھے اور اس دوران وہ اسرائیلی جیلوں کی اصلیت سے بھی آگاہ ہو چکے تھے کہ اب ان کی جلاوطنی کی طویل زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ابھی ایک سال ہی بیتا تھا کہ انہیں قاہرہ میں پناہ لینی پڑی اور پھر وہاں سے بیروت منتقل ہونا پڑا۔ جہاں ۱۹۷۸ء میں یاسر عرفات کی ایک مجلس میں فیضؔ صاحب سے ان کی ملاقات کروائی گئی۔۱۹۸۲ء میں جب اسرائیلیوں نے بیروت پر حملہ کیا تو جہاں فیضؔ صاحب کو بیروت چھوڑنا پڑا اور وہ ماسکو سدھارے۔ وہاں محمود درویش نے بھی یونان کی راہ لی۔محمود درویش کی مشہور زمانہ طویل نظم ''بیروت پر حملہ'' اسی زمانے کی یادگار ہے۔محمود درویش وطنِ فلسطین سے اپنی محبت اور کسی عرب دوشیزہ کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کو باہم گڈمڈ کرتے رہتے ہیں۔ایک ہی نظم میں، بلکہ نظم کے ایک ہی بند میں ان کی محبوبہ کبھی گوشت و پوست کا انسان ہوتی ہے اور کبھی ان کے بچھڑے ہوئے وطن کی سرزمین! اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ان کی محبوبہ فلسطین کی اُن سب بیٹیوں کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے، جن میں سے کوئی قہوہ خانوں میں کام کرتی ہے تو کوئی چرواہی بن کر پہاڑوں میں گھومتی ہے اور کوئی اپنے یتیم بچوں کے کپڑے دھوکر سکھانے کے لیے الگنی پر ڈال رہی ہوتی ہے۔فیضؔ صاحب نے ہمیں محمود درویش کی

جو کتاب نظموں کا اردو ترجمہ کرنے کے لیے دی تھی اس میں شامل ایک نظم'' کچھ آنسو بچالو

ماں" کا ہم نے پہلے نثری ترجمہ کیا:

ماں!

اشکوں کو اپنے رخساروں سے نہ اکھاڑو

یونہی جما رہنے دو

کہ آنسوؤں کی بھی جڑیں ہوتی ہیں

ان آنسوؤں کو آنے والی ہر اُس شام کے لیے بچا رکھو

جب سڑکیں لاشوں سے پٹ جائیں

اور تمہارے بیٹے کی طرح

مسافروں کو راستہ نہ ملے

اور کچھ آنسو محفوظ کرلو

ان بے وطنوں کے لیے جو پہلے مر چکے ہیں

اور مرنے والے ہیں۔

فیضؔ صاحب نے نثری ترجمہ پسند فرمایا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ: زلفی صاحب! ترجمہ میں شاعری کی اوریجنل زبان اور محاوروں کی لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ اگر آپ میری کسی نظم کا عربی زبان میں ترجمہ کریں تو، یہ ترجمہ پڑھنے والے کو وہ لطف نہیں آئے گا جو ایک اردو کے قاری کو آتا ہے۔ بہر حال اب آپ اس نثری ترجمہ کو منظوم ترجمہ میں ڈھالیں اور اپنی عربی دانی کے بل پر کوشش کریں کہ اردو یا فارسی کے الفاظ کم سے کم استعمال ہوں۔

اور تب ہی ہم نے العصافیر تموت فی الجلیل سے اپنی منتخب کی ہوئی نظم غریب فی مدینة بعید فیضؔ صاحب کو سنائی:

عندما كنت صغيراً

و جميلاً

و الينا بيع بحاری

الورده جرحاً صارت

و الينا بيع ظلماً

هل تغيَرت كثيراً ؟

تغيرّت كثيراً ما

عندما ترجع كالريح

الى منزلنا

جيهتى حذقى فى

تجدى الورد نخيلا

و الينا بيع عرق

تجدينى مثلما كنت

صغيراً

و جميلاً ..

فیضؔ صاحب نظم سے بہت متاثر ہوئے۔ کہنے لگے: زلفی میاں! ہمیں آپ کی عربی دانی پر رشک آتا ہے کہ آپ نے شہر جدّہ کے ایک عربی اسکول "مدرسة الفلاح" سے محض پرائمری پاس کی ہے لیکن عربوں کی طرح، فر فر عربی بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں جبکہ ہم نے تو عربی میں ماسٹرز کیا ہے... لیکن مولوی مدن جیسی بات کہاں!

فیضؔ صاحب کی اس محبت بھری ستائش پر ہم بیحد شرمائے۔۔ فیضؔ صاحب جب بھی شفقت آمیز بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہمارا یہی حال ہوتا تھا کہ فیضؔ صاحب اور بیگم ایلسؔ کا احترام ہمیشہ مانع رہتا۔

جب محمود درویش کو پڑھنا شروع کیا تو قدرتی طور پر دل میں ان سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ لہٰذا ایک روز اپنی اس خواہش کا اظہار فیضؔ صاحب سے کیا۔ مزید اپنی اس خواہش کو سہارا دینے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ ان سے بالمشافہ ملاقات، بات چیت اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے بعد یقیناً ان کے کلام کا ترجمہ کرنے میں آسانی بھی ہو جائے گی۔

فیضؔ صاحب نے فرمایا: ہاں ہاں ضرور ملوادیں گے۔ ایسا کریں اگلے اتوار کو آپ ہمارے گھر

آ جائیں۔ لنچ ہمارے ساتھ کریں۔ میں محمود درویش کو بھی بلا لیتا ہوں۔ بھئی یہ تو بہت اچھا ہو جائے گا کہ آپ براہِ راست ان سے عربی میں بات کر سکیں گے چونکہ ان کی انگریزی بہت کمزور ہے البتہ فرنچ پر انہیں عبور حاصل ہے۔

محمود درویش عمر میں ہم سے پورے پانچ سال بڑے تھے۔ پورے پانچ سال اس لیے کہ ان کی ولادت جولائی ۱۹۴۲ء کی ہے اور ہماری جولائی ۱۹۴۷ء کی لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی تو مغربی لباس میں ملبوس، کلین شیو، سرخ و سفید رنگت اور بھوری آنکھوں والا محض ۳۶ سالہ یہ نوجوان اپنی عمر سے بڑا اور بیحد بُردبار لگ رہا تھا!

محمود درویش نے دو شادیاں کیں، اور دونوں کا انجام طلاق پر ہوا۔ پہلی شادی ایک عربی نثر نگار رنا قبانی سے کی۔ جبکہ ۱۹۸۰ء سے وسط میں دوسری شادی ایک مصری مترجمہ حیاۃ حینی سے ہوئی۔ البتہ کسی بیوی سے بچّہ کوئی نہ ہوا۔ دل کے عارضے کا مسلسل شکار رہے اور بارٹ سرجری کے تین دن بعد ۶۷ برس کی عمر میں ۹ راگست ۲۰۰۸ء کو ہیوسٹن ٹیکساس، امریکہ میں انتقال ہوا۔ محمود درویش کی شاعری کی تیس اور نثری آٹھ کتابیں شائع ہوئیں۔ فیضؔ صاحب کی طرح محمود درویش کو بھی ۱۹۸۳ء سوویت یونین کی جانب سے لینن پرائز ملا۔ فیض احمد فیضؔ ہی طرح محمود درویش کا کلام بھی ریڈیو، ٹی وی اور فلموں میں بہت گایا گیا اور بیحد مقبول ہوا۔

اُن دنوں کچھ لوگ کہتے تھے کہ محمود درویش کی شاعری مزاحمتی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی ۔ وہ صرف اختلاف واعتراض کی شاعری ہے۔ یہی بات جب ہم نے بیروت میں فیضؔ صاحب کی قیام گاہ پر محمود درویش سے پوچھی تو وہ قدرے جذباتی سے ہو گئے اور کہا:

لوگ کچھ بھی کہیں، میرے لیے شاعر ہونے کے ناتے جو چیز اہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں اپنا کام کرتا چلا جاؤں، بغیر یہ سوچے کہ میں کس طرح کا شاعر ہوں اور شاعری میں میرا رتبہ کیا ہے۔ مزاحمت کی شاعری میں جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، وطن کی مدافعت کے مقصد کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے، ایسی قوتوں کے خلاف مدافعت، جو وطن کو اپنے جبر وتسلط میں لانا چاہتی ہیں۔ چنانچہ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں، اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس سے ایک ایسا انسان ابھر کے سامنے آئے گا جو مختلف صورتوں اور مختلف لبادوں میں وطن کا دفاع ہی کر رہا ہوتا ہے اور میں ہر اُس

طاقت کا مدِ مقابل ٹھہرتا ہوں جو مجھ سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے۔ زمین میرے لیے محض زمین نہیں ہے۔ درخت محض درخت نہیں ہیں، اور شام کوئی سی شام نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں فطرتNature کا شاعر نہیں ہوں۔ میں ایک سرزمین کا شاعر ہوں، وطن کا شاعر ہوں اور میرا اعتراض و احتجاج جُز کی طرف سے کُل کے خلاف نہیں ہے بلکہ ایک قابض و معاند کے خلاف ہے۔ میں اپنے جیلر سے بات کر لیتا ہوں تو صرف اس لیے کہ میں بولنا چاہتا ہوں اور مسلسل تنہائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے اور اگر میں اپنے جیلر کی بیوی سے نفرت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اُن لوگوں کے ساتھ گھل مِل گیا ہوں۔ اس موقع پر محمود نے چار مصرعے پڑھے:

خليفة في قفص
بين وصيف وبغا
يقول ما قالا له
كما تقول البغا

(خلیفہ پنجرے کا طوطا ہے۔ کچھ وفاداروں اور کچھ نافرمانوں میں گھرا ہوا۔ وہی کہتا ہے جو اسے پڑھایا جاتا ہے)

ہم دیکھ رہے تھے عربی زبان میں بات کرنے والے محمود درویش کے چہرے پر اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں ایک تکلیف دہ تناؤ سا آ گیا بیا ور فیض صاحب بغیر پلک جھپکائے انہیں گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا بات کا رخ بدلتے ہوئے ہم نے محمود کو مبارک باد دی: الاخ محمود! مبارک ہو کہ آپ کو ایفرو ایشیائی مصنفین کی انجمن کی جانب سے ''لوٹس'' ایوارڈ ملا ہے۔

کہنے لگے: مجھے معلوم نہیں کہ میں اِس انعام کا حقدار بھی تھا یا نہیں لیکن یہ جب ملا تو مجھے اچھا لگا۔ اس لیے کہ اس کی بدولت میرے مسئلے کو التفات حاصل ہوا ہے اور میں اپنی راہ پر آگے بڑھتے چلے جانے کی ہمت اپنے اندر پاتا ہوں۔ پھر یہ کہ اِس انعام سے ہمارے گرد کھڑے حصار میں ایک چھوٹا سا دریچہ کھل گیا ہے (عربی میں محمود نے یہاں ''شبکہ'' (کھڑکی) کہا تھا جسے ہم نے ''دریچہ'' لکھا ہے) جس میں سے میری اور میرے ساتھیوں کی آواز افریقی ایشیائی سامعین کی

زیادہ تعداد تک پہنچ سکے گی لیکن اس اعزاز کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں مجھ پر نئی ذمہ داری کا بوجھ آ پڑا ہے۔

رخصت سے پہلے محمود درویش سے کچھ سنانے کی فرمائش تو انہوں نے اپنی نظم ''ہمارے حاکمو!'' سنائی:

تم نے ہماری سرزمین کو قبرستان میں بدل دیا ہے
تم نے ہمارے سروں میں گولیاں بوئی ہیں
اور خوں ریزی کو نظریہ بنایا ہے
ہمارے حاکمو!
کوئی عمل اپنے احتساب کے بغیر مکمل نہیں
تم نے جو کچھ میرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے
اس کا حساب ہوگا
بھولنے کا امکان نہیں
وہ سب تاریخ کے ماتھے پر رقم ہے۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان سے نکل کر فیض صاحب پہلے دلّی گئے جہاں مختصر قیام کے بعد ماسکو چلے گئے،

جہاں ان کا کافی عرصہ تک قیام رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افرو ایشیائی ادیبوں کے ترجمان رسالہ ''لوٹس'' کے صدر دفتر کے مقام کا فیصلہ کافی سوچ بچار کے بعد بیروت کے حق میں ہوا تھا۔

اسی ضمن میں ایک اور بڑا فیصلہ ''لوٹس'' کے مدیرِ اعلیٰ کے عہدہ کے لیے فیض احمد فیضؔ کے حق میں ہوا۔ ایلس فیض کو ان کی سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس طرح اوائلِ ۱۹۷۸ء میں یاسر عرفات نے ان دونوں کو بیروت روانہ کر دیا۔ یہاں فیضؔ صاحب کو ''لوٹس میگزین'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داریوں کا بھاری حصّہ اٹھانا پڑا۔ جن میں بے شمار دفتری کاغذات، رپورٹوں، دستاویزات، وغیرہ کا تیار کرنا تھا، جس پر بہت زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایشیائی اور افریقی ممالک کے نوجوان ادیب و شعراء کی تصنیفات کی نوک پلک درست کرنا، ان کی اصلاح

کرنا اور یہ بات خود فیض صاحب نے مجھے بتائی کہ بیشتر انہیں ایسی کمزور تحقیقات از سر نو تحریر کرنا ہوتی ہیں تاکہ انہیں رسالہ میں جگہ مل سکے اور یہ سب کچھ کرنے کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا، وہ صرف یہی تھا کہ نوآزاد پسماندہ ممالک کے ادیبوں کی اس صورت میں مدد کرنا فیض صاحب اپنا بین الاقوامی فرض سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ "لوٹس" کو شائع کرنے کے لیے معیاری تحقیقات نہیں ملتی تھیں۔

البتہ ایسی تحریروں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

ایک اتوار کو اپنے معمول کی ملاقات کے لیے اپنی نوٹ بک سنبھالے ہم فیض صاحب کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خاموش اور متفکر ہیں۔ ہمارے دریافت کرنے پر گویا ہوئے:

"زنگی! بھئی میں کل رات سے سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں الجھا ہوا ہوں۔"

ہم نے ایکدم ان کی بات پکڑتے ہوئے ازراہ مذاق ہنستے ہوئے کہا:

"شکر ہے فیض صاحب کہ آپ آیت" میں "الجھے ہوئے ہیں۔ آیت" سے "نہیں الجھے!"

ہمارا یہ فقرہ سن کر وہ بھی ہنس دیے اور بولے:

"گویا تو آپ بھی ہمیں اللہ کا منکر سمجھتے ہیں!"

ہم نے جلدی سے ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور کہا:

"سر آپ تو سنجیدہ ہوگئے۔۔۔ جی فرمائیے۔۔۔ آپ کس آیت میں الجھے ہوئے ہیں"

فیض صاحب گویا ہوئے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین یعنی: "اور تمہارے لیے زمین مستقر اور متاع ہے ایک خاص وقت تک"۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ انسان زمین سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر اس کا مالک نہیں ہوسکتا۔ اس کا مالک خدا آپ ہے اور اقبالؔ بھی اسی نظریے کے قائل ہیں۔ زنگی! میں آپ کو ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔ پنجاب کے ایک پیر صاحب نے اقبالؔ سے ایک درخواست لکھ دینے کی فرمائش کی، ہوا یوں تھا کہ اُن دنوں سرکاری طرف سے لوگوں میں زمین تقسیم ہورہی تھی اور پیر صاحب چاہتے تھے کہ زمین کا ایک آدھ قطعہ انہیں بھی مل جائے۔ اقبالؔ نے کہا کہ درخواست تو میں لکھے دیتا ہوں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ درخواست پیش کس کے سامنے کرنا

ہوگی؟ پیر صاحب اس بات کو کیا سمجھتے،، خاموش ہو رہے۔ پھر اقبالؔ نے خود ہی کہا کہ پیر صاحب! ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام قرآن ہے۔ اس کتاب کو خدا نے اپنے آخری نبی پر اتارا جن کا نام محمد ﷺ تھا۔ یہ نبی عرب کے رہنے والے تھے۔ ان کی وفات کو تیرہ سو سال ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اب اگر آپ چاہیں تو میں درخوست خدا کے نام لکھ دوں۔

فیضؔ صاحب نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا۔

اقبالؔ کو میں مسلم سوشلسٹ کہتا ہوں کیونکہ وہ زمین کے معاملے میں قومی ملکیت کے قائل ہیں۔ کاشتکار سے ملت کا خزانۂ عامرہ تو بجا طور پر پیداوار کا کچھ حصہ طلب کر سکتا ہے لیکن کسی ناکردہ مالک کا اس پر کوئی حق نہیں۔

ہم نے عرض کی بجا فرمایا آپ نے۔ لیکن فیضؔ صاحب یہ تو فرمائیں کہ علامہ اقبالؔ سے آپ کا عشق کتنا پرانا ہے؟

فیضؔ صاحب مسکرائے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے گویا ہوئے:

بھئی یہ غالباً ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ اُس وقت ہم یہی کوئی چھ سات سال کے تھے جب ہم نے پہلی بار انہیں سیالکوٹ میں انجمن اسلامیہ اسکول کے ایک جلسہ میں دیکھا تھا۔ ہمیں اس جلسے میں شرکت کا موقع اس لیے دیا گیا تھا کہ ہمیں قرآت سنانی تھی۔ لہٰذا کسی نے ہمیں باقاعدہ اٹھا کر علامہ اقبالؔ کے سامنے رکھی ہوئی میز پر کھڑا کر دیا تھا کہ اب تلاوت کرو۔ اس کے بعد تو ہمیں ان سے کئی بار شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ ایک تو وہ ہمارے ہم وطن تھے۔ دوسرے ہمارے والد بیرسٹر سلطان محمد خاں جولندن میں افغانستان کے سفیر بھی تھے۔ ان کے دوست بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبالؔ بھی لندن میں ہوتے تھے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں جب ہم گونمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے انگریزی کے طالب علم تھے۔ تو ہم نے کالج کے میگزین راویؔ کے لیے اقبالؔ پر ایک نظم کہی تھی۔ جو اب ہماری کسی کتاب میں بھی شامل نہیں ہے لیکن ہماری یہ نظم اُس دور کے طالب علموں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ مختلف موقعوں پر بار بار سنی گئی۔ اس لیے ہمیں بھی حفظ ہوگئی تھی۔

فیضؔ صاحب کے منہ سے یہ بات سن کر ہم نے نہایت تجسس کے ساتھ ان سے درخواست کی

کہ چیز آپ اپنی یادداشت پر زور دے کر ہمیں وہ نظم ضرور سنائیں۔

فیض صاحب نے اپنے مخصوص صوفے پر پہلو بدلا۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں ماتھے پر پھیریں اور ۴۵ سال قبل کہی ہوئی نظم سنانا شروع کر دی:

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ یزداں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیز انگیز ہنگامے
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں
سنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی
"عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا"

فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
نمود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے

ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک ذرّے کو ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے
فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ حُسن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

فیضؔ صاحب کی نظم سن کر ہم ایک دم ان سے پوچھ بیٹھے: جب آپ اقبالؔ کی تعلیمات سے اس قدر متاثر تھے تو آپ نے ان کا رنگ کیوں اختیار نہیں کیا؟

فیضؔ صاحب نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے فرمایا: ''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری شاعری میں اقبالؔ کا رنگ نہیں ہے! بنیادی طور پر میں نے ان کا رنگ قبول کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اُن کا اسلوب الگ ہے اور میرا طرزِ بیان دوسرا لیکن جہاں تک انسان دوستی، انسان کی عظمت، عدل وانصاف، استحصال کا خاتمہ، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج۔ یہ سب ان ہی کی تعلیمات کا اثر ہے۔

فیضؔ صاحب کی باتیں سن کر مجھے اقبالؔ اور فیضؔ کے درمیان وہ ذہنی قربت اور مماثلت نظر آئی کہ ان دونوں کے درمیان فرقِ مراتب کا احساس جاتا رہا کہ یہ فرقِ مراتب در سیاست کے کسی خاص نظام سے فیض یاب ہونے یا تعلیم و تربیت کا نہیں بلکہ ان منفرد اور خاص الخاص تخلیقی صلاحیتوں کا ہے جو بندوں کے لیے خدائے بخشندہ کا عطیہ ہوتی ہیں اور کسی درسی اور کسی تعلیم و تربیت اور کسی محنت و مشقت سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ اقبالؔ جیسے دل و دماغ اور فیضؔ جیسی عظیم تخلیقی صلاحیتوں کا دردمند آدمی تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ فیضؔ کی دردمندی اشتراکیت کی مرہونِ منت نہیں۔ یہ ان کی فطرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی وابستگی کے نتیجے میں کچلی ہوئی انسانیت کا غم کرنے سے پیشتر ہی یہ ان کی رومانی افسردگی میں جھلکتی تھی، چنانچہ اس کا اظہار ''دلے بفرد ختم، جانے خریدم، سے قبل ان کی رومانی نظموں میں ملتا ہے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کہ

اشتراکی نظریے سے وابستگی نے ان کے جذبۂ دردمندی کو تیز کیا۔جیسا کہ ان کی منظومات سے ظاہر ہوتا ہے۔ان کی دردمندی ذاتی بھی ہے،اوراجتماعی بھی۔یہ عصری صورتِ حال کی پیدا کردہ ہے اورانسانیت کی صدیوں کی مظلومیت سے بھی ہم رشتہ ہے۔یہ ملکی حالات کی زائیدہ بھی ہے اور بین الاقوامی سطح پرانسانی صورتِ حال کا پتا بھی دیتی ہے۔اس لیے یہ وسیع تر انسانی دردمندی پر منتج ہوتی ہے اوران کے نشاطیہ رؤیے کے باوجود دل کو کچوکے لگاتی ہے۔یہ دردمندی وجودی سطح پر جدید انسان کی بے چارگی،تنہائی اوراجنبیت کا احساس دلاتی ہے۔

گرانیٔ شبِ ہجراں دو چند کیا کرتے
علاجِ دردِ، ترے دردمند کیا کرتے

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

فیضؔ کی زندگی میں ''نجاتِ دیدہ و دل'' کی چند گھڑیاں ضرور آئیں ہیں،ان گھڑیوں میں انہوں نے ذہن کی اس روشنی کو پالیا تھا جو توانائی کی غیر استدلالی شدت سے پیوستہ ہے۔انہوں نے عصری آگہی کے کرب کا احساس کیا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ عصری آگہی کا ایک ایسا ایمائی اظہار کیا ہے جو معاصر سیاسی یا سماجی قوتوں کی آویزش کو خیر وشر کی ازلی کشمکش میں تبدیل کرتا ہے۔فیضؔ کی شاعری کا یہی پہلو ہے جو انہیں معاصرت کی سطح سے بلند کر کے نئے دور کی شکست خوردہ نسلوں کے قریب کرتا ہے۔ایسے ہی اشعار ان کا سرمایۂ حیات ہیں اوران کی انفرادیت کے ضامن ہیں۔

رہے ان کے وہ اشعار جو رومانی،سماجی یا عشقیہ تصورات پر محیط ہیں اور شعری تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔وہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر دلالت تو کرتے ہیں لیکن ان کو وہ ہمہ گیریت عطاء نہیں کر سکتے جو میرؔ و غالبؔ کا حصہ ہے۔اس لیے کہ یہ اپنی امکانی حدود کے اسیر ہیں۔

بیروت میں قیام کے دوران دو سال کے عرصہ میں فیضؔ صاحب کو قریب سے دیکھنے اوران کے صوفیانہ اوصاف سے اپنی عملی زندگی کو سنوارنے کا موقع ملا۔میں نے دیکھا کہ فیضؔ صاحب میں بے پناہ قوتِ برداشت تھی۔اس پر دنیا سے بے نیازی کی ایک انوکھی شان تھی۔ان کی درویش

صفتی کا یہ عالم تھا کہ جب عبداللہ ہارون کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تو ڈاکٹر نصرت ہارون، فیضؔ صاحب کے گھر، ہارون ٹرسٹ کی طرف سے ان کا مشاہرہ طے کرنے کے لیے گئیں۔ بار باران سے درخواست کی کہ ہارون کالج کے پرنسپل کی تنخواہ ٹرسٹ والوں نے تین ہزار روپے ماہانہ مقرر کی ہے۔ہمیں آپ کو اتنی تنخواہ ہی دینا پڑے گی۔فیضؔ صاحب بضد تھے وہ اتنی تنخواہ لے کر کیا کریں گے۔انہوں نے نصرت ہارون سے صرف بارہ سو روپے مانگے۔اس پر نصرت نے کہا اٹھارہ سو روپے سے کم نہیں ہو سکتے۔لہٰذا فیضؔ صاحب نے بہ حالتِ مجبوری کہ اٹھارہ سو روپے سے کم نہیں ہو سکتے۔یہ مشاہرہ قبول کیا!اسی طرح بےخوفی کی مجاہدانہ شان بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔اس ضمن میں بھی ہم ایک واقعہ سناتے چلیں۔بیروت میں اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد جولائی ۱۹۸۰ء میں ہم سعودی عربیہ واپس،سعودی ائر لائنز میں اپنی ملازمت پر چلے گئے لیکن اب چونکہ دو سال کے عرصہ میں فیضؔ صاحب سے ملاقات اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔لہٰذا اپنی ائر لائنز کی ملازمت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ہم بالعموم ویک اینڈ پر بیروت کے چکر لگاتے رہتے تھے۔یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے جب اسرائیلیوں نے باقاعدہ بیروت پر حملوں کا آغاز کیا۔یہ بات ہمیں بیگم فیض نے بتائی کہ ایک رات بمباری کے دوران ان کے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔جب ایلسؔ نے انہیں جگا کر اس خوفناک صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ یہ کہہ کر کروٹ بدل کر سو گئے کہ''اچھا صبح دیکھیں گے''بےخوفی اور بے نیازی کی یہ والہانہ ادا ان کے وجود میں ایک گہرے مجاہدے کا پتا دیتی ہے۔ایک مجاہدہ اور مراقبہ آدمی کے لہو میں خود بخود مصروفِ عمل رہتا ہے۔

سعودی ائر لائنز میں بیس سالہ ملازمت کے دوران اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری کے لیے ہمارا دنیا بھر کے ان تمام ممالک میں (جہاں ہماری ائر لائنز جاتی ہے) قائم اپنے اسٹیشنوں پر جانا لگا رہتا تھا۔لہٰذا اس دوران وہاں کے تاریخی،ثقافتی،سماجی،علمی،ادبی،فنی اور سیاسی مظاہر کا اپنے زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیا اور ان ممالک کے مشہور اور اہم شہروں پر مختصر مگر جامع ''سیاحی نظمیں'' لکھیں جو''آگرہ سے نیاگرہ''کے نام سے میرے کینیڈا منتقل ہونے کے بعد کتابی شکل میں شائع

ہوئیں تھیں۔ اسی سلسلے میں ہم نے بیروت پر بھی ایک نظم کہنا شروع کی۔ گو ہمارا بیروت کا چکر تو ۱۹۷۰ء سے ہی لگنا شروع ہو گیا تھا۔ اس دوران بقول شخصے ہم نے بیروت کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ وہ اچھے دن تھے۔ جنگ کا طبل ابھی نہیں بجا تھا۔ بیروت کی رنگینیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اُس زمانے میں ساری عرب دنیا کے شیوخ بیروت ہی کا کلمہ پڑھتے تھے۔ خیر۔ ہم نے بھی ۱۹۷۸ء میں بیروت پر سیاحی نظم کہنا شروع کی۔

ایک دن فیضؔ صاحب کے پوچھنے پر کہ ''بھئی آج کل صرف پڑھائی ہو رہی ہے یا شعر و یر بھی ہو رہے ہیں'' ہم نے انہیں، بیروت پر کہی اپنی یہ نظم سنائی:

تختہ ہائے سبزہ و گُل ہیں قطار اندر قطار
ان شجر ہائے بلوط و سرو پہ دائم بہار
اک عجوبۂ زمانہ بعلبکؔ کے یہ کھنڈر
قومِ پیگنؔ کے یہ معبد اور مقدّس بام و در
شارعِ حمراء پہ ڈھایا نوجوانوں نے غضب
مہوشوں سے جب ہوئے سینہ بہ سینہ لب بہ لب
کم سِنوں کی کیبرے کے رقص میں بے باکیاں
وہ تھرکتے زاویے وہ جھانکتی گولائیاں
جلتی بجھتی روشنی کے رنگ، یہ ڈسکو کا شور
نوجواں جوڑوں کی سنگت اور جوانی کا وہ زور

نوٹ: یہ نظم ۱۹۸۲ء میں درج ذیل دو شعروں کے ساتھ مکمل ہوئی تھی۔

اب جو رُت بدلی تو ویراں ہو گئے سارے مقام
موت رقصاں، رنگ دھندلے، گھر کھنڈر، بے کیف شام
مل گئی ہے رہروی کی دیکھئے آخر سزا
شام ہے شامِ غریباں، صبح، صبحِ کربلا

نظم سنے کے بعد فیضؔ صاحب گویا ہوئے: ''بھئی نظم کی اٹھان تو اچھی ہے۔ جب مکمل ہوجائے تو ہمیں ضرور سنائیے گا لیکن اِس نظم میں آپ نے جن مقامات کا ذکر کیا ہے اور نقشہ کھینچا ہے۔ تو کبھی ہمیں بھی ان کی سیر کروائیں!''

ہم نے عرض کی۔ ارے فیضؔ صاحب آپ جب حکم فرمائیں، ہم آپ کو ایک ایک کر کے دکھا دیں گے یہ سب جگہیں۔

کہنے لگے: پھر اگلے اتوار کو چلتے ہیں۔

ہم نے عرض کی۔ سر! اگلے ویک اینڈ پر تو میں دو دن کی اضافی چھٹی لے کر فیملی سے ملنے جدّہ جا رہا ہوں۔ اُس کے بعد کا اتوار ٹھیک رہے گا۔

پاکستان میں فیضؔ صاحب بہت لیے دیئے رہنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی شاعری کا ایک وصف ''ایک قسم کی خود ضبطی'' تھی لیکن وہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی جذباتیت کا بھی شکار ہو جاتے تھے۔ مثلاً ان کی مشہور غزل:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

ہم دیکھتے ہیں کہ اس غزل میں جذبہ نہیں جذباتیت ہے۔ شاعرانہ وجدان قاری کی قوتِ تخیّل اور جذبے، دونوں پر سحر طاری کرتا ہے۔ شاعری کا وہ مواد جو آواز اور امیجری کی صورت اختیار کرتا ہے، وہ پورا آدمی ہے جو سوچتا ہے، ارادہ کرتا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے۔ جو طاقت ور بھی ہے اور کمزور بھی، عظیم بھی ہے، ستم رسیدہ بھی، اچھا بھی، برا بھی۔ وہ آدمی جو زندگی کی خوشیوں اور غموں میں جا پھنسا ہے، جو عجیب مٹھاس اور نرمی سے ہیجانات، خواہشات، ترکِ دنیا اور اثباتِ حیات کے درمیان پارہ پارہ ہے اور زندگی سے اس قدر بندھا ہوا کہ جانتا ہے شاعری کیا ہے اور اس کی مسرت کیا ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں کیسے شریک ہوا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ خوشی کیسے وجود میں آتی ہے اور کس طرح درد سے ہمکنار ہوتی ہے۔ دراصل وہ اپنی کامل ہیئت سے حُسن پیدا کرنے والی خوشی حاصل کرتا ہے۔ بلاشبہ فیضؔ کے اندر بھی ایک ایسا پورا انسان موجود تھا جو تلخیوں کے سمندر میں پیرنے کے باوجود قطرہ قطرہ مسرت اور حُسن کشید کر سکتا تھا۔ اسی

لیےان کی شاعری میں ساعتِ بے زار کے رنگوں کو راحتِ دیدار کے رنگ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے لذت اور الم کے وسیع تر نظریے پر اپنے شعری قصر کی بنیاد رکھی ہے اور اس کی آرائش کے لیے چمپئی پھولوں، سرمئی لمحوں، زرد پتوں، سرخ کلیوں، تاریک راتوں اور سبز ساعتوں کا انتخاب کیا ہے۔فیض کے مزاج کی آسائش، ملائمت اور خواب کی کیفیت، ضبط کا نشہ، پھولوں اور موسموں سے محبت، خوبصورت چہروں کی دل افروزی اور خالص رومانوی معیارِ حیات۔ان سب چیزوں نے مل کر ان کی شخصیت اور شاعری کو منفرد، خوابناک اور رنگین بنادیا ہے۔اپنی اسی تنوع پسندی کے باعث وہ جدید نسل کے واحد خوش قسمت شاعر ہیں جس سے قدیم طرزِ سخن کے شعراء بھی خوش ہیں اور نئی نسل کے جدید یئے بھی مطمئن۔انہوں نے انقلاب اور ترقی پسندی کے نعروں کو وہ شعری نزاکتیں بخشی ہیں جو ان سے پہلے کم از کم اردو ادب میں موجود نہ تھیں۔ایک طرف ان کی شاعری کے رنگ اشتراکی وانقلابی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان سے ایک ایسی فضا ترتیب پاتی ہے جو خالصتاً فیض کی اپنی فضاء ہے۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا انتظار ہم فیض صاحب سے بیروت میں اپنی پہلی ملاقات سے کر رہے تھے۔معمول کے مطابق جب ہم اتوار کے دن اُن کے فلیٹ پر پہنچے تو انہیں اپنی ایک تازہ مکمل کی ہوئی نظم کو Fair کرتے ہوئے پایا۔انہوں نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا:

آئیں بھئی بیٹھیں۔

ہم سلام کر کے صوفے پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔چند ہی لمحوں میں وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے اور Rough پیپر کو مٹھی میں مروڑ کر کونے میں رکھی ہوئی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے فرمایا:

اور بھئی کیا حال چال ہیں۔پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔

ہم نے کہا فرسٹ کلاس سر!

اور پھر تجسس سے پوچھا: کیا ہو رہا ہے فیض صاحب!

بولے: بھئی کافی دنوں سے ایک نظم لکھی رکھی تھی۔آپ اسے ''نذرِ غالبؔ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔پچھلے ہفتے جب لندن گئے تھے وہیں مکمل کی تھی لیکن اسے Fair کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، بس وہی لکھ رہے تھے۔

ہمیں جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ ابھی جو کاغذ فیضؔ صاحب نے مروڑ کر ٹوکری میں پھینکا ہے وہ ان کی تازہ نظم رف فارم میں تھی تو ہم نے لپک کر ٹوکری سے اسے نکالا اور اپنی نوٹ بک پر پھیلا کر سیدھا کرنے کے بعد حفاظت سے اندر رکھ لیا۔ اس دوران فیضؔ صاحب اپنی شفیق مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتے رہے۔

پھر گویا ہوئے: ارے بھئی۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔ آخر وہ کٹی پھٹی نظم آپ کے کس کام کی!

ہم نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے۔ صرف اتنا کہا: حضور! آپ کی کٹی پھٹی نظم ہمارے لیے کسی مرقع سے کم نہیں۔

فیضؔ صاحب چونکہ اُس وقت خوشگوار موڈ میں تھے اور اُن پر سرشاری کی وہی کیفیت طاری تھی جو کسی بھی فنکار کی اپنے فن پارے کی اطمینان بخش تکمیل پر ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے پہلی بار فیضؔ صاحب سے درخواست کی، کیا ہمیں اس نظم کو سب سے پہلے سننے کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے!

فیضؔ صاحب نے اپنی طمانیت بھرے چہرے پر شفیق مسکراہٹ کو مزید گہرا کرتے ہوئے۔ نیا سگریٹ سلگایا۔ نظم کا عنوان ''دلِ من مسافرِ من'' بتا کر... گویا ہوئے:

مرے دل، مرے مسافر

ہوا پھر سے حکم صادر

کہ وطن بدر ہوں ہم تم

دیں گلی گلی صدائیں

کریں رخ نگر نگر کا

کہ سراغ کوئی پائیں

کسی یارِ نامہ بر کا

ہر اک اجنبی سے پوچھیں

جو پتا تھا اپنے گھر کا

سرِ کوئے ناشنایاں

ہمیں دن سے رات کرنا

کبھی اِس سے بات کرنا

کبھی اُس سے بات کرنا

تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے

شبِ غم بری بلا ہے

ہمیں یہ بھی تھا غنیمت

جو کوئی شمار ہوتا

ہمیں کیا بُرا تھا مرنا

اگر ایک بار ہوتا

فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھ کر میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا جیسے تمام سکون واطمینان ان کے جسم و ذہن میں سمٹ آیا ہے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو اپنے چہرے پر نہیں ظاہر ہونے دیتے تھے لیکن آج نظم ختم کرنے کے بعد ہم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ فیضؔ صاحب کچھ اداس، مضطرب اور بکھرے بکھرے سے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ وہ جب ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو انہیں تنہائی چاہیئے ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے ان سے اجازت چاہی اور اپنے یونیورسٹی کیمپس کا رخ کیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ہم نے نوٹ بک سے فیضؔ صاحب کی نظم نکال کر اسے غور سے پڑھنا شروع کیا۔ دیکھا کہ فیضؔ نے جلاوطنی کی وجدانیہ شاعری میں ہجر کی اذیت ناک کیفیات کے زیرِ اثر اپنے لب و لہجے کو تو بدلا ہے لیکن شعر کی صورت نہیں بدلی۔ اس نظم میں کئی تصرفات بھی ہیں۔ کچھ ہیئت کا تجربہ بھی ہے لیکن بڑی حد تک قافیہ بند شاعری کی حدود میں رہتے ہوئے۔ الفاظ کی کفایت بھی ہے اور خیال کا ارتقاء بھی۔ ردیف و قافیہ اور صوت و آہنگ کے لیے مستند بحر بھی ہے۔ نظم سنانے کے بعد فیضؔ صاحب ڈیپریشن کی جس شدید کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے، اسے دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ جلاوطنی کے ان اذیت ناک دنوں کو کاٹنے کے لیے فیضؔ صاحب نے اچھا

کیا کہ خود کو کسی نہ کسی کام سے منسلک ہی رکھا۔ پہلے تو یہ کہ ان کی نظر سے قومی مسائل بھی اوجھل نہیں ہوئے۔ پاکستان کی فضاء میں ایک توازن کی تلاش اور طلب جاری رہی۔ دوسرے یہ کہ ان کا شغف ایشیاء اور افریقہ کی ادبی اور تہذیبی تحریکوں سے بڑھ گیا۔ تیسرے یہ کہ یونیسکو نے ان کی شاعری کے توسط سے جدید اردو شاعری کو مغرب سے متعارف کروایا اور آخری بات یہ کہ وہ تحریکِ فلسطین سے منسلک رہے اور فلسطینی کاز کو تقویت پہنچانے کے لیے کام کیا اور یہ سب کچھ انہوں نے ''لوٹس'' کی ادارت کے زمانے میں کیا۔ واضح رہے کہ انہوں نے کئی زبانوں کی فکر کو اس رسالہ میں اکھٹا بھی کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قیامِ بیروت 1982-1978 کے دوران انہیں تواتر کے ساتھ دہلی، ماسکو، شام، عراق، مصر، الجزائر، جاپان، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ بھی بلایا گیا۔

فیض احمد فیض کی اسی اہمیت، مقبولیت اور پزیرائی کو دیکھ کر ان کے بعض حاسد معاصرین کے، ترقی پسند تحریک کے مخالفین اور اسٹیبلشمنٹ کے پیش کردہ نظریۂ پاکستان کے بعض وکیلوں کے فتویٰ نما تبصرے سامنے آتے رہے۔ فیض صاحب کے ساتھ تو یہ بھی مشکل ہے کہ اپنی شاعری کی ابتداء کے ساتھ ہی انہوں نے جن نظریات و افکار کو اپنایا، مرتے دم تک ان میں نہ تبدیلی آئی، نہ انہوں نے اس میں کوئی ترمیم کی۔ ان نظریات و افکار کے بغیر ان کی شاعری اور شخصیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فیض کے مخالفین اور الجھنوں میں مبتلا لوگ غالب ہی کا روّیہ اپنا لیتے تو بات بن سکتی تھی کہ وہ فیض صاحب کی وفاداری بشرطِ استواری کو ہی اصلِ ایمان قرار دے سکتے تھے مگر اس کے لیے تو بڑے ظرف کی ضروت ہے۔ فیض صاحب کی شاعری میں جو حسن ہے جو شعریت ہے۔ شاعری کی دیوی Muse جس طرح ان پر مہربان تھی، اس کا تو سب ذکر کرتے ہیں لیکن ان کی خوبصورت ترین شاعری اور ان کے بھرپور دلوں میں اتر جانے والے لہجے کے ساتھ فیض کی شاعری کا یہ بھی حسن ہے کہ وہ دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے شاعر تھے۔ اس عقیدے اور مسلک کے حوالے سے انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ ان کی زندگی اور جدوجہد شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے اپنے مسلک کے لیے بڑی بڑی صعوبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں۔ پھر ان کا ڈھنڈورا بھی نہ پیٹا۔ ہیرو بننے کی بھی کوشش نہ کی کیونکہ وہ تو تھے ہی ہیرو۔ اقبال کے بعد اردو شاعری کے افق پر جوش، فراق اور فیض کا بھرپور انداز میں ظہور ہوتا ہے۔ پھر ن۔م۔راشد ہیں

جن کے اردو شاعری پر گہرے اثرات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

راشد کے ہاں جو عمق اور فکری گہرائی اور شعری کرافٹ ہے۔ اس نے انہیں بڑی شاعری کا خالق بنایا ہے لیکن اپنی تمام تر بڑائی کے باوجود راشد۔ بین الاقوامی شہرت اور مقام حاصل نہ کر سکے۔ جوش صاحب اور فراق صاحب کا اردو شاعری میں جو مقام ہے اس سے بھی کوئی منکر نہیں ہو سکتا لیکن فراق اور جوش بھی عالمی شہرت حاصل نہ کر سکے۔ فیض بطور انسان اور بحیثیت شاعر۔ میرے نزدیک جہاں نیشنلسٹ بھی تھے وہاں انٹر نیشنلسٹ بھی تھے۔ ژئیس، لوئی آراگان، ایذرا پنڈ، ٹی۔ ایس ایلیٹ، رابرٹ فراسٹ، کارل سینڈ برگ، لورکا، پاسترناک، ڈلن تھامس اور ناظم حکمت کا فیض صاحب کی رحلت سے بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ سینگال کے سینگھو راور چلی کے پابلونرودا، جو شہرت اور نظریاتی مسلک کے اعتبار سے فیض کے "حریف" قرار دیئے جا سکتے تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اپنی شاعری کے آفاقی تناظر، انسان دوستی، محبت اور بین الاقوامی مقبولیت کے اعتبار سے فیض بیسویں صدی کے سب سے بڑے زندہ شاعر تھے۔ فیض صاحب کی شاعری مشاہدے، حسن اور تخلیقی سوز دروں کی شاعری ہے۔ اس شاعری میں وہ حسن ہے جو دنیا بھر کے انسانوں کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فیض پوری انسانیت اور پوری دنیا کے شاعر تھے۔

یہ فیض کی سخت جانی اور ظرف کا کمال تھا کہ وہ چیخے نہیں، تڑپے نہیں۔ ورنہ فیض کو تو ہم سن اکاون ہی میں کھا کے ہضم کر چکے ہوتے۔ زنداں نصیب شاعر کو ان بیڑیوں سے، پس مرگ فیض نوازیوں یا اسکرین آمیز محبتوں نے نہیں نکالا بلکہ ان کو جو محبت انسانیت سے تھی۔ یہ اس کا طفیل ہے کہ وہ مر کے جی اٹھے۔ ان کی زندگی ہنگاموں سے پُر تھی مگر وہ جینے کے ہاتھوں مرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ موت کی کوکھ سے زندگی نمودار کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ یہ میرا بیروت کے زمانے کا مشاہدہ ہے کہ فیض صاحب بڑے ٹھنڈے میٹھے آدمی تھے۔ غصہ ان کو بالکل ہی نہیں آتا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ کسی نے انہیں غیظ میں نہیں دیکھا۔ یاروں نے کیسے تیر ان پر نہ چھوڑے۔ کس کس گالی سے ان کو نہیں نوازا مگر یہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ نہ گالی، نہ غصہ، نہ اشتعال۔ وہی محبت و مروّت میں لپٹی، انکسار و اختصار میں رنگی بے غرض و بے لوث مسکراہٹ ہر انسانی چہرے پر چھڑک

رہے ہیں۔

تازہ نظم سنائی جانے والی ملاقات کے چند روز بعد جب ہم نے فیض صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے لیے انہیں فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے میڈیکل چیک اپ کے سلسلے میں تین چار ہفتے کے لیے لندن جا رہے ہیں۔

فیض صاحب کی لندن سے واپسی پر ہم چھٹی کے دن ان سے ملنے گئے۔ دیکھا کافی حد تک تازہ دم ہیں۔ چہرے پر قدرے بحالی ہے۔ سکون ہے۔ اور یہ یقیناً ماحول۔ آب و ہوا۔ اور معمولاتِ زندگی میں تبدیلی کی دین تھی۔

لندن میں میڈیکل چیک اپ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد۔ خود ہی گویا ہوئے: بھئی ایک نظم کہی ہے۔ لندن میں تو سب کو سنا آئے۔ اب آپ کو کیوں محروم رکھیں۔

فیض صاحب کے منہ سے ان کے تازہ کلام کا سن کر۔ ہم تو پھڑک اٹھے۔ جلدی سے اپنی نوٹ بک اور قلم سنبھالا اور عرض کیا۔ عطا ہو!

ہم جتنے بیتاب تھے۔ فیض صاحب نے اس سے زیادہ تحمل سے اپنی نظم ''کوئی عاشق کسی محبوبہ سے'' سنانی شروع کی:

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا

پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو

عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد

پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو

جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی

آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد

اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا

ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ

اَن کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا

کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم

کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا

گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے

تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں

تم جو چاہو تو سنو

اور جو نہ چاہو نہ سنو

اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں

تم جو چاہو تو کہو

اور جو نہ چاہو نہ کہو

نظم سنانے کے بعد فیض صاحب تو حسب عادت اپنی سماعت اور گویائی کا ''سوئچ آف'' کر کے ''غائب'' ہو گئے۔

ہم سوچنے لگے کہ فیض کے کلام کا سننا یا پڑھنا، ہمیں اُس دور کے عمومی عصری رجحانات کی طرف لے جاتا ہے اور ایک نصف صدی، اہم تخلیقی ادب کی ارتقائی منزلوں کے لیے کوئی طویل مدت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اردو ہو یا کوئی اور ایشیائی زبان ہو، تخلیق و تحقیق کے لیے نصف صدی کے اندر تین نسلوں کے اہم کام کی جڑیں ملتی ہیں۔ فیض کی ایک نظم ''سوچنے دو'' روسی شاعر وزنیسن سکی کے نام ہے، جو اُن سے ۲۲ سال چھوٹے ہیں لیکن ان سے پہلے بھی ایک قد آور نسل تھی۔ اقبال، حسرت، جوش و فراق کی نسل۔ فیض نے اس نسل کا احترام کیا۔ اسی طرح ان کے بعد آنے والی نسل نے ان کو ہمیشہ محترم سمجھا اور وہ نسل ان کو فقرے بازیاں مارنے والی نسل نہیں تھی۔ نہ اس نسل میں ان کی تخلیقی، معیاری، تہذیبی سطح کے ادراک کی کمی تھی۔ شاید اس احترام کا ثبوت ان تک پہنچ چکا تھا۔ بہر کیف تخلیق کا سلسلہ کسی ایک منزل پر نہیں رکتا، ہر دور کے تخلیقی ادب میں مواد اور ہیئت کا تغیر گذشتہ دور کے کسی قدر فنی اور فکر یا انحراف احساسات کی ایک دوسری نوع کی سمت ضرور آ جاتی ہے

جس کی تہہ میں روایات کا تسلسل بھی کارفرما ملتا ہے۔فیضؔ کی شاعری کا ایک اہم باب عرب اسرائیل جنگ۔ برسوں کی جلاوطن فلسطینی آبادی کی ایک آزاد ریاست قائم کرنے کی تحریک سے تھا۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے قیامِ بیروت کے دوران کی شاعری"مرے دل مرے مسافر" کو قائدِ تحریکِ فلسطین ابوعمار یاسر عرفات سے منسوب کیا ہے۔

اپنے قیامِ بیروت کے عرصہ میں، اپنی تعلیمی مصروفیت کے ساتھ ساتھ فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھ کر، ان کے افکار سننے اور ان کی تخلیقی صلاحیت کی کارکردگی، ان کے اسلوب ولفظیات کی اندورونی ساخت اور،ان کی شعری فکر کی معنویت کو سمجھنے کا موقع مل بھی ملا۔کسی بھی شاعر کے کلام میں ان عناصر کے تجسس میں اگر ہمیں مثبت اور متحرک اجزاملیں تو صرف یہی نہیں کہ قبولیت کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں بلکہ اس کے کلام کی بنیادی حیثیت بھی یہ ہو جاتی ہے کہ اس نے سوچ کے ایک نئے موڑ پر۔اضطراری، ہیجانی اور تشنج آمیز کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی تاریخ اور روایات سے منسلک فکر کو آگے بڑھا رہا ہے۔اس کی آگہی عہدِ حاضر میں اپنی ضرورتوں کا پاس کرتی ہے، جس کے بغیر فرد اور معاشرے کی زندگی بے معنی ہو جائے گی۔ اسی طرح تغیرات سے پیوستہ۔اس کی ابیات۔ایک طرف اپنے ورثے کا حصہ ہیں اور دوسری طرف فکرِ نو کا اشارہ ہیں۔ فیضؔ کے کلام میں یہ خوبیاں اسی طرح موجود ہیں جیسے ایک شجر کی زندگی میں اس کا عہدِ نمو ہوتا ہے۔فیضؔ نے تیسری دھائی میں کہا تھا۔ غلامی"اپنے اجداد کی میراث ہے مجبور ہیں ہم" اُس دور سے پانچ سال بعد تک ان کے شعری تجربوں کی کئی منزلیں ملیں گی لیکن ان کی خوش کلامی کی نموپروری اپنی تاریخ بدلتی ہوئی دنیا۔اپنی روایات کے اندر جاری رہی۔ان مسائل پر گفتگو بار بار نکلتی ہے لیکن ان کے دور کی شعری نفسیات کے بدل جانے کی وجہ سے،ان کی شاعری میں روایت کا دخل پورے سیاق وسباق سے سامنے نہیں آتا ہے۔اسے سمجھانے کی ضرورت ہے اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا مجھے اپنے قیامِ بیروت کے دوران براہِ راست۔اسے فیضؔ صاحب کی زبانی سمجھنے کا موقع ملا۔ یہ سلسلہ میری ماسٹرز کی تعلیم مکمل ہونے کے اور سعودی عربیہ واپس چلے جانے کے بعد بھی وقفے وقفے سے جاری رہا۔ وہ اس طرح کہ اپنی ائر لائنز کی ملازمت اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کی بجاآوری کے لیے بیروت کے متعدد پھیرے لگانے کے دوران ۱۹۸۲ء تک جب جب

فیض صاحب مجھے بیروت میں ملے۔ اپنی "نوٹ بک" کے ساتھ ضرور ان سے ملاقات کی اور ہر مرتبہ ان کی فکر اور تخلیقی ہنر کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو میرے سامنے آیا۔

اسی طرح ۱۹۸۰ء، بیروت میں کہی جانے والی فیض صاحب کی نظم "میرے ملنے والے" کے حوالے سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے جب یہ نظم کہی تو، بیروت میں ان کے مداحوں میں اس "اکلوتے ہم وطن مداح" کو سب سے پہلے یہ نظم سننے کا اعزاز حاصل ہے:

وہ در کھلا میرے غمکدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرشِ افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے
وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے
وہ دوپہر آئی، آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے
یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
یہ کون آیا، کب گیا ہے
نگاہوں کو خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزاروں وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

فیض صاحب کم گو، نفاست پسند اور عالی دماغ انسان تھے۔ لفظوں کے جوہری، فکری کمال اور لسانی جمال کے تاجدار، غزل کے بادشاہ، فکر میں روایت شکن، لفظوں میں روایت پسند، لفظوں سے ایسی وضع داری اور یاری نبھائی کہ ان کی قدر، مقدور اور نصیبہ بدل گیا۔ غالبؔ کا عمق، اقبالؔ کی وسعتوں سے ہوتا ہوا فیضؔ کے کاروبارِ گلشن میں داخل ہوا تو تخلیقی جدتوں سے ہم کنار ہو کر تازہ بستیاں آباد کرنے لگا۔ فیضؔ کے ہر مصرعے اور ہر لفظ کے پیچھے ایک شیریں چھپی بیٹھی ہے جو نطق و کلام میں شیرینیاں بانٹتی، پھول برساتی فکر کے افق پر نمودار ہوتی ہے تو سخن کی بدلیوں سے لالہ فام رم جھم برسات برسنا شروع ہوتی ہے۔ فیضؔ اپنے فلسفہ وفکر پر مدام قائم و دائم رہے۔ کوئی قہر، کوئی مہران کو اس راہ سے ہٹا نہ سکا۔ مختصر بات کام کی بات، ایک ہی بات۔ وہ سنار تھے، مگر لوہار کا ہتھوڑا بھی پاس رکھتے تھے۔ لگی لپٹی، ہیر پھیر، منافقت وریا سے کبھی کسی طرح کا تعلق و واسطہ نہ رکھا۔ جو کہا ڈنکے کی چوٹ پہ کہا۔ مگر خوشبوؤں، رنگوں، نغموں کے لپکوں میں لپیٹ کر کہا۔ فلسفے کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنا دیا۔ وہ رکے تو کوہِ گراں تھے۔ چلے تو جاں سے گزر گئے۔

یہ جون ۱۹۷۹ء کی بات ہے کہ فیضؔ صاحب نے سمرقند سے واپسی پر اپنی ایک تازہ نظم "تین آوازیں" سنائی جس کے تین حصے تھے: ظالم۔ مظلوم۔ ندائے غیب:

ظالم

جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے

سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے

اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا

فصلِ گُل آئے گی نمرود کے انگار لیے

اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا

ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے

میرا مسلک بھی نیا، راہِ طریقت بھی نئی

میرے قانوں بھی نئے، میری شریعت بھی نئی

اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے

سرو قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے

فرش پر آج درِ صدق و صفاء بند ہُوا

عرش پر آج ہر اک بابِ دعا بند ہُوا

مظلوم

رات چھائی تو ہر اک درد کے دھارے چھوٹے

صبح پھوٹی تو ہر اک زخم کے ٹانکے ٹوٹے

دوپہر آئی تو ہر رَگ نے لہو برسایا

دن ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا

یا خدا یہ مری ردانِ شب و روز و سحر

یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر

کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تُو نے

ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تُو نے

وہ یہ کہتے ہیں، تُو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے

وہ یہ کہتے ہیں، ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے

گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟

ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

ندائے غیب

ہر اک اولی الامر کو صدا دو

کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے

اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں

پڑیں گے دار و رسن کے لالے

کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی

یہیں عذاب و ثواب ہوگا

یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر

یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

لبنان کا دارالحکومت 'بیروت' کئے از قدیم ترین انسانی آبادی کا شہر ہے۔ تقریباً پانچ ہزار سال قبل بھی بیروت، کنعان (فونیشیائی تہذیب) ساحل کا ایک بامراد شہر کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں اسے 'بیروتھ' (چشموں کا شہر) کہا جاتا تھا۔ بیروت بحرۂ روم کے ساحل کی ایک ایسی ممتاز جگہ پر آباد ہے جس کی پشت پر عجوبۂ روزگار پہاڑی سلسلہ ہے۔ بیروت رومن امپائر کے زمانے میں بھی بیحد جلیل القدر شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اُس دوران اسے 'کولونیا'، 'جولیا'، 'اوگستا'، 'فیلکس' اور 'بیروتھ' پکارا جاتا تھا۔ یہ بیروت ہی ہے جسے انسانی تاریخ کا پہلا ''اسکول آف لاء'' قائم کرنے کا فخر حاصل ہے۔ 'اسکول آف لاء' کا سنہری دور، رومن امپائر لوئیس ہفتم سنہ، (۱۹۳۔۲۱۱) کا زمانہ

ہے جب بیروت، ایتھنز اور روم کے لاء اسکولوں پر سبقت لے گیا تھا۔ ان ہی دنوں بیروت اسکول آف لاء کے پروفیسروں نے مشہورِ زمانہ "مجموعۂ قوانین" مرتب کیا تھا۔ جس کے سبب بیروت کو "مادرِ قانون سازی" کا خطاب دیا گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۵۵۱ء میں آنے والے ایک بھیانک زلزلے نے بیروت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ جس کے سو سال بعد عرب مسلمانوں نے اسے فتح کیا جس کے بعد یہاں ۱۱۰۹ء میں صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عثمانیوں نے یہاں ۱۹۱۲ء تک چار سو سال حکومت کی۔ ۱۹۴۳ء تک فرانس کے زیرِ انتظام رہا۔ ۱۹۸۱۔۱۹۸۲ء کے دوران فلسطینی مجاہدین کے زیرِ انتظام رہا اور ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء میں اسرائیلیوں کا تسلط قائم رہا۔ ۱۹۹۰ء میں شامی فوجیوں کے زیرِ انتظام آ گیا۔ بیروت کی سیاسی تاریخ بے حد ہنگامہ خیز رہی ہے اور اس دوران بیروت سات مرتبہ مکمل طور پر پامال کیا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود بیروت ہمیشہ سے ایک انفرادی تہذیبی اور تجارتی مرکز رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ستر کی دہائی میں بیروت مشرقِ وسطیٰ کا پیرس کہلاتا تھا اور عرب ممالک کے شیوخ کا گھر آنگن ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ جب فیضی صاحب الجزائر کے مختصر دورے کے بعد بیروت واپس آئے تو کہنے لگے بھئی آپ نے کہا تھا کہ ہمیں یہاں کے تاریخی آثار دکھائیں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے اگلے اتوار ہم آپ کو بعلبک کے کھنڈرات دکھانے لے چلتے ہیں۔

بعلبک کو "سورج کا شہر" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۳۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر وادیٔ بقاء میں واقع ہے۔ بعلبک کے کھنڈرات اپنے دامن میں عہدِ روما کی تعمیرات سے دنیا کی عظیم ترین اور نہایت بہتر حالت میں محفوظ قوی ہیکل تعمیری ڈھانچہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ جو رومن کے بلند ترین ستونوں والے معبدوں کا کمپلیکس ہے۔ جہاں رومن دیوتاؤں کی عبادت کی جاتی تھی۔ ان جگہوں کو دیکھنے کے دوران جب ہم لوگ "معبد عطارد" کے کھنڈرات میں داخل ہوئے تو اس وقت تک فیضی صاحب بے حد تھک چکے تھے۔ لہٰذا ہم نے اپنے کاندھے پر لٹکے سفری بیگ سے مشروب کی بوتل نکال کر انہیں پیش کی اور فیضی صاحب، میں ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ جب ذرا سانس بحال ہوئی تو وہ کسی مشاق گائیڈ کی طرح Jupiter Temple کی تاریخ بیان کرنے لگے اور بتایا کہ یہ جو آپ اس معبد کے صرف چھ سالم ستون دیکھ رہے ہیں۔ اصل میں اس معبد کے ۵۴ ستون

تھے اور یہ معبد ۳۰۰۰ قبلِ مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ فیض صاحب کے منہ سے بعلبک کے کھنڈارت کی تفصیلات سن سن کر ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑے صاحب اپنا ''ہوم ورک'' کر کے آئے ہیں۔ بہر حال اب چونکہ دن بھی ڈھل چلا تھا اور فیض صاحب بھی کافی تھک چکے تھے۔ لہٰذا اگلی بار عہدِ خلافتِ امیہ میں تعمیر کی جانے والی عظیم مملوک مساجد جو اطراف میں پھیلے قدیم سفید اور سلیٹی پہاڑوں سے سلیں تراش کر تعمیر کی گئیں تھیں۔ دیکھنے کا پروگرام طے کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپسی ہوئی۔

ہم نے کیا یہ تھا کہ حصولِ تعلیم کے لیے بیروت منتقلی کے دن جدّہ سے اپنے ذاتی استعمال کی نئی کار، بحری جہاز سے بیروت روانہ کر دی تھی۔ تا کہ وہاں گھومنے پھرنے میں سہولت رہے اور اب جب ہماری کار جدّہ سے بیروت پورٹ پر پہنچ گئی تو ''جمارك البنانيه بيروت'' کی جانب سے اطلاع آ گئی کہ آ کر اپنی گاڑی لے جائیں۔ لہٰذا یہ خوش خبری ہم نے فیض صاحب کو دی اور کہا کہ اب ہماری گاڑی آ گئی ہے لہٰذا اگلے اتوار کو ہم آپ کو عہدِ خلافت اُمیّہ میں تعمیر کی جانے والی عظیم مملوک مسجد ''مسجد الغميری'' دکھانے لے چلیں گے۔

مملوک مسلم بادشاہوں نے مصر، شام اور لبنان کے کچھ حصّوں پر گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک حکمرانی کی۔ اس دوران بیروت کو شرقِ اوسط اور یورپ کے درمیان تجارتی سطح پر مرکزی حیثیت حاصل ہوئی جس کے سبب لبنان کو معاشی، تجارتی، علمی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی عروج حاصل ہوا جو مملوک دورِ حکومت کے اختتام تک قائم رہا۔ اُسی دور میں اسلامی طرزِ تعمیر کی عکاس لاتعداد عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں مملوک مساجد نمایاں اور قابلِ دید ہیں۔ اسی سلسلۂ تعمیر کی ایک عظیم مسجد ''مسجد الغمير'' ہے۔ جو الحمراء میں شارع جلو اور شارع پیرس کے سنگم پر واقع ہے اور ہم اسی عظیم الشان مسجد کی زیارت کے لیے فیض صاحب کو لے کر گئے۔ اس مسجد کی تعمیر بیروت شہر کے اطراف میں پھیلے ہوئے سفید اور سلیٹی پہاڑوں سے سلیں تراش کر، کی گئی ہے۔ جس آرکیٹیکٹ نے اسے ڈیزائن کیا ہے، اُس نے اس کی ڈیزائننگ اور ڈیکوریشن میں اپنی اعلیٰ فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسجد کا بہت بڑا گنبد، خوبصورت بلند محرابیں، چوڑے اور پھول پتوں سے تراشیدہ درجنوں ستون، وسیع اور عریض صحن۔ مختصر یہ کہ ''مسجد الغميری''

کا شمار دنیا کی عالیشان مساجد میں ہوتا ہے۔ فیض صاحب تو اس مسجد میں داخل ہو کر مبہوت سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس کے ایک ایک ستون، دیوار اور تراش خراش کو بغور جائزہ لیا اور اس کے تعمیری حسن سے بیحد متاثر ہوئے۔

فیض احمد فیض کے مذہب کے حوالے سے ہم نے کہیں پڑھا ہوا تھا کہ کسی مذہبی انتہا پسند نے فیض صاحب سے ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا۔

ان کا جواب تھا "میرا مذہب وہی ہے، جو مولانا رومی کا تھا۔"

پوچھا گیا "مولانا رومی کا کیا مذہب تھا"

فیض نے کہا "اُن کا مذہب وہی تھا، جو میرا ہے۔"

فیض کے اس جواب پر، اُن صاحب نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے۔ خالی نظروں سے فیض صاحب کی جانب دیکھا۔

فیض صاحب نے وضاحت کی۔ "ایک بار واعظان کرام مولانا رومی کے پاس پہنچے اور ان سے، ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا، کہ آپ کا تعلق کس فرقے سے ہے؟ رومی نے جواب دیا کہ تمام ۷۲ فرقوں سے۔ واعظان کرام کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ لہذا ان میں سے ایک نے فتویٰ صادر کیا کہ "پھر تو آپ مرتد اور کافر ٹھہرے" مولانا رومی نے برجستہ جواب دیا۔ "اگر آپ اس پر خوش ہیں، تو مان لیتا ہوں۔"

فیض صاحب کے حوالے سے اس واقعے کی بنیاد پر، بیروت کی ایک ملاقات میں ایک روز فیض صاحب سے پوچھا: فیض صاحب! کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟

فیض صاحب نے فرمایا: آپ کے لیے بھی میرا وہی جواب ہے لیکن یہاں میں مذہب اور دین کے حوالے سے ایک تقابلی جائزہ پیش کرنا چاہوں گا:

☆ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق اور داخلی تجربے کا نام ہے۔

☆ دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔

☆ مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔

☆ دین میں معاشرے کا انداز اور آئین بتاسکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے یا نہیں

☆ مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔

☆ دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

☆ مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے انسانی اعمال کے صحیح نتائج کو پرکھا جا سکے

☆ دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج بتاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔

☆ مذہب انسان کو فرقوں میں بانٹتا ہے اور ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔

☆ دین میں تفرقہ شرک ہے۔ دین اسلام، پوری نوع انسانی کے لئے ہے۔ رب، رب العالمین ہے

☆ مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کیے چلا جاتا ہے

☆ دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سفلی جذبات پر قابو پانے کی تعلیم دیتا ہے۔

☆ مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

☆ دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

☆ مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

☆ دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

☆ مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بناتا ہے۔

☆ دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

☆ مذہب آغوشِ خانقاہ میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسان کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے

☆ دین، وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام اور نظام خداوندی کو ہر شے پر غالب کرنا عبادت

☆ مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور اللہ کی نعمتوں سے اجتناب سکھاتا ہے۔

☆ دین، اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو اللہ کی پیدا کی زیب و زینت کی اشیاء کو تم پر حرام کرتا ہے

☆ مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

☆ دین کہتا ہے کل یوم ھو فی شان۔ ہر نئے دور میں جدت طرازی تقاضائے حیات ہے

☆ مذہب، اسلاف کے پیش کردہ عقائد پر ایمان بالجبر دوسری نسل پر زور دیتا ہے۔

☆ دین، مسلک اسلاف کی بلا دلیل پیروی سے منع اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے

☆ مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں کبھی ملوکیت (فرعون) سرمایہ دارانہ (قارون) اور مذہبی پیشوایت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور خود، مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

☆ دین، مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی۔ کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لیے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لیے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

اس لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے، دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں، دین کی اطاعت کرتا ہے۔ فیضؔ صاحب کی اس عالمانہ گفتگو نے دین، مذہب اور ان کے عقیدے کے حوالے سے ان کی پوزیشن کلیئر کر دی۔

یہ سنہ ۱۹۸۰ء کا وسطی زمانہ تھا۔ اُن دنوں بیروت کی فضاء انتہائی شکست خوردگی اور ناکسی کے لمحے کی مظہر تھی۔ ساری دنیا اس بات کی تماشائی۔ ایک ذرا سی امید پیدا ہوتی کہ مایوسی چھا جاتی۔ اُن ہی دنوں ایک مرتبہ کی ملاقات میں فیضؔ صاحب نے اپنی تازہ نظم ''کیا کریں'' سنائی۔ جو غیر یقینی... گھبراہٹ... اور... بددلی.... کی منہ بولتی تصویر ہے:

مری تری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دل فگار ہیں
جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں

جو میرے تیرے شہر کی
ہر اک گلی میں
میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاندکی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا، بنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا

نظم کی اختتامی سطور میں ''بتا، بتا'' کی تکرار میں کتنا تذبذب اور عدم اعتماد ہے۔ شاعر کو کتنے سوالوں کے جواب کا انتظار ہے۔ ہر مصرع ایک استعارہ ایک دبی ہوئی چیخ اور درد کی کراہ معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے عہد کے عظیم شاعر اور بیحد پیارے انسان فیض احمد فیضؔ نے جو ورثہ چھوڑا ہے، ہم اس ورثے سے جتنا بھی استفادہ کریں کم ہے۔ یہ ورثہ زندگی کے کئی شعبوں پر محیط ہے کیونکہ فیضؔ نہ صرف شاعر بلکہ مفکر، نقاد، صحافی، ٹریڈ یونیسٹ اور انسان دوست سیاست داں بھی تھے۔ وہ ایک

نظریۂ حیات کے شاعر تھے۔ان کی شاعری اور زندگی اس نظریے کی عکاس ہے۔۱۹۳۵ء میں جب فیضؔ نے ترقی پسندی کے دبستان میں قدم رکھا تو یہ سیکھا کہ فرد کی ذات انسانی معاشرے سے منسلک ہے۔وہ بجائے خود، بہت ہی محدود اور حقیر ہے لیکن عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے اسے پہنائی اور وسعت بخشتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک ہی تجربے کے دو پہلو بن جاتے ہیں۔فیض احمد فیضؔ اردو دنیا میں اپنے اشتراکی نظریات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔وہ مذہب پرست، جو شاعری کو مذہب یا تصوف کے کسی پہلو کی تبلیغ کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔وہ فیضؔ کے اُن اشعار کو پیش کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ فیضؔ کے دل کے کسی گوشے سے مذہب یا تصوف جھانکتا رہتا تھا۔ان کا یہ کہنا کسی حد تک درست ہے۔معجزے کے انتظار کے علاوہ فیضؔ کی بیشتر نظمیں مذہبی مفہوم میں ''قیامت'' اور اشتراکی مفہوم میں ''انقلاب'' جیسے اہم فلسفوں کو کچھ اس طرح سے پیش کرتی ہیں کہ دونوں فلسفوں میں امتیاز قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔تھیم کے اعتبار سے دونوں فلسفوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔دونوں فلسفے استحصال سے پاک نئی زندگی کے ظہور کو یقینی سمجھتے ہیں۔دونوں فلسفوں میں معیاری جست لگتی ہے۔صور کا پھونکا جانا اور انقلاب کا برپا ہونا۔ایک نظام کا خاتمہ، کسی دوسرے نظام کی زندگی کی صورت میں نکلتا ہے جس کی مثال بیروت میں جلاوطنی کے دوسرے پڑاؤ کے عرصے میں کہی ہوئی فیضؔ صاحب کی مشہور نظم ''ویبقیٰ وجہ ربک'' ہے۔بیروت ۱۹۷۹ء میں پہلی بار جب یہ نظم میں نے ان کی زبانی سنی تو مجھ پر ایک وجدانی کیفیت سی طاری ہو گئی تھی:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں

روئی کی طرح اُڑ جائیں گے

ہم محکوموں کے پاؤں تلے

جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی

اور اہلِ حکم کے سر اُوپر

جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی

جب ارضِ خدا کے کعبے سے

سب بت اٹھوائے جائیں گے

ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم

مسند پہ بٹھائے جائیں گے

سب تاج اچھالے جائیں گے

سب تخت گرائے جائیں گے

بس نام رہے گا اللہ کا

جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی

اٹھے گا انا الحق کا نعرہ

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلقِ خدا

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اردو کی عشقیہ شاعری کے صدیوں پرانے الفاظ کو فیض نے برتتے ہوئے ان میں انفرادی شان کس طرح پیدا کی، معنی آفرینی اور حُسن کاری کا حق کس طرح ادا کیا، ان میں جو نئے نئے معنوی امکانات پیدا کئے وہ ان کے ذہن کی خلاّقی کا کارنامہ ہیں۔ مثلاً انہوں نے کہا:

گلچیں ۔(سیاسی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ ڈالنے والے عوامل)

حاکم ۔(سامراج /سرمایہ داری /تانا شاہی /عسکری نظام)

عقل ۔(مصلحت کوشی، منفعت اندیشی، جابر نظام، دفتر شاہی یا عسکری نظام سے سمجھوتہ بازی)محتسب، شیخ ۔(سامراجی نظام /سرمایہ دارانہ ریاست /عوام دشمن حکومت / رجعت پسندانہ نظام /

ظلمت پسند یا زوال آمادہ ذہنیت)

ہجر، فراق ۔(جبر /ظلم /استحصال کی حالت / یا انقلاب سے دوری)

رقیب ۔(سامراج /سرمایہ داری)

گل ۔(سیاسی آدرش /نصب العین)

زنداں، دار ورسن ۔(سیاسی قید / پھانسی / جان کی قربانی)

حسن، حق ۔(سماجی انصاف /انقلاب /سماجی سچائی)

شراب، میخانہ، پیالہ، ساقی ۔(سماجی اور سیاسی بیداری کے ذرائع)

وصل ۔انقلاب /آزادی /حریت /سماجی تبدیلی)

معشوق ۔(وطن /عوام)

بلبل، عندلیب ۔(جذبۂ قومیت، حریت سے سرشار شاعر /انقلابی

مجاہد ۔(مجاہد آزادی /انقلابی)

جنون ۔(سماجی انصاف /انقلاب /انقلاب کی خواہش /تڑپ)

رند ۔(مجاہد /انقلابی / باغی)

عشق ۔(انقلابی ولولہ /جذبۂ حریت)

عاشق ۔مجاہد /انقلابی)

اسی تناظر میں فیض کی ایک اور نظم دیکھتے ہیں، اپنی یہ تازہ نظم بھی انہوں نے ۱۹۷۹ء ہی میں تاشقند سے واپسی پر سنائی تھی:

لاؤ تو قتل نامہ مرا

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازیِ میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

قیامِ بیروت کے دوران ''تخلیقِ ادب'' کے حوالے سے بار با فیضؔ صاحب سے گفتگو رہی۔میں نے دیکھا کہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ ادب کی تخلیق ایک سماجی فعل ہے۔اُن کے نزدیک ادب الفاظ کے وسیلے سے انسانی تجزیے کے مؤثر اور باسلیقہ اظہار کا نام ہے۔وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے:

دیکھیں زلفی! ادیب سماج کا ایک باشعور رکن ہوتا ہے۔اپنے سماج یا معاشرے سے ادیب کے دو رشتے ہیں۔ایک سماج کے عام رکن کی حیثیت سے اور دوسرا ادیب کی حیثیت سے۔اس طرح ادیب پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔عام رکن کی حیثیت سے اس پر وہ تمام ذمے داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں جو دیگر تمام اراکین پر عائد ہیں۔ادیب کی حیثیت سے اس پر یہ خصوصی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی تخلیقات اور تحریریں باطل کے خلاف حق کا ساتھ دیں، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کریں،حُسن کو فروغ دیں اور بدصورتی کو رد کریں۔علم کی روشنی کو پھیلائیں اور جہالت کی تاریکیاں دور کریں،انسانیت سے محبت پیدا کریں،بربریت اور نفرت کا

خاتمہ کریں، نیکی اور پاکیزگی کی طرف مائل کریں اور انسان دشمنی اور خودغرضی کا درس نہ دیں۔

فیض نے امن کا لینن انعام قبول کرنے کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا:

''امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں، اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست و دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں، جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور استحصال کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں، جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔''

فیض نے اپنے وطن اور تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں میں آزادی کی قوت، یعنی غریب، محنت کش اور مظلوم عوام کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنے وطن کے عوام کے حقوق کے لیے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے عوام کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور افریقی لوگوں، ایرانی جوانوں اور فلسطینی مجاہدوں کے لیے نغمے لکھے۔ اس وقت جب لبنان میں خانہ جنگی ہو رہی تھی اور اسرائیل نے حملہ کر دیا تھا اور صیہونی فوجوں کے ٹینک، توپیں اور طیارے بیروت پر آگ برسا رہے تھے۔ میں تو اپنی تعلیم مکمل کر کے جدہ واپس جا چکا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ فیض صاحب تب بھی پوری استقامت کے ساتھ بیروت کے ایک فلیٹ میں بیٹھے تیسری دنیا کے ترجمان میگزین ''لوٹس'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس دوران کچھ عرصے کے لیے جب اسرائیل کی بمباری میں وقفہ آیا اور یو این او کی امن فوج بیروت پہنچی تو بیرونی ممالک کی فضائی پروازیں بحال ہوئیں، تو میں بھی اپنی ائرلائنز کی منصبی ذمے داریوں کی ادائیگی کے لیے بیروت گیا اور موقع ملتے ہی فیض صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ان کے فلیٹ پر حاضری دی۔ اس بلڈنگ کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اطراف کی دیگر عمارتوں کے ساتھ ان کے فلیٹ والی بلڈنگ پر بھی جابجا بمباری کی ٹوٹ پھوٹ نظر آ رہی تھی۔ بیشتر کھڑکیوں بشمول ان کے فلیٹ کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ جب میں لرزیدہ قدموں اور

دھڑکتے دل کے ساتھ فیض صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوا تو انہیں نہایت صبر وسکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا پایا۔

میں نے پوچھا فیض صاحب آپ لوگ خیریت سے تو ہیں نا۔کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟ آپ لوگ کسی اور محفوظ جگہ منتقل کیوں نہیں ہو جاتے۔

میری اس تمام فکر وتشویش کے جواب میں فیض صاحب نے صرف اتنا کہا: بھئی اب کہاں جائیں گے۔پورا بیروت ہی زد میں ہے اور اب تو UNO کی امن فوج بھی آ گئی ہے۔کچھ دن سے سکون بھی ہے۔اب آپ واپس جا کر ہر پرسانِ حال کو بتا دیں کہ میں خیریت سے ہوں۔

ہم نے عرض کیا: فیض صاحب اِس کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے تو بدلوالیں۔آج کل سردی بھی کافی ہے اور پھر ساحلِ سمندر کی ٹھنڈی ہوائیں۔آپ کے جوڑوں کا درد نہ شروع ہو جائے۔

کہنے لگے: بھئی بلڈنگ کا مالک آیا تھا۔کہہ رہا تھا کہ ابھی بلڈنگ کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کروانا بیکار ہے۔ہوسکتا ہے کل پھر کوئی اسرائیلی جہاز بمب ٹپکا جائے۔

فیض صاحب سے ملاقات کے دوران ہمیشہ ہمیں اس بات کا احساس رہتا تھا کہ بیروت ایک ایسا شہر ہے جہاں ان کا کوئی ہم زبان، سننے سنانے والا نہیں ہے۔لہذا ان سے اپنی ہر ملاقات کے موقع پر ہم ان کا تازہ کلام ضرور سنتے۔اسی طرح وہ بھی اکثر یہ کہہ کر کہ:''بھئی ہم نے تو کچھ کہا نہیں ہے۔آپ ہی کچھ سنائیں'' ہماری ہمت افزائی فرماتے رہتے۔

اس مرتبہ بھی جب ہم نے پوچھا: فیض صاحب! بیروت میں توپوں کی اِس گھن گرج کے دوران کچھ لکھا۔

کہنے لگے: ہاں بھئی کچھ شعر کہے تو ہیں۔

ہم نے مودبانہ درخواست کی۔عطا ہوں حضور۔

انہوں نے اپنے فلیٹ کی شیشہ ٹوٹی کھڑکی سے باہر سمندر کے ساکت پانی پر نظریں ٹھہرا کر اپنی نامکمل غزل سنائی:

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں کبھی قربتیں

یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کئی شامِ ہجر کی مدتیں
جو تمہاری مان لیں ناصحا، تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں
چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم، جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں
مری جان، آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

عوام دوستی اور وطن پرستی ہی نے فیضؔ کی رہنمائی انسان دوستی اور انسانیت پرستی کی طرف کی تھی۔ حبِ وطن اور حبِ انسانیت کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ دونوں کی بنیاد محبت ہے۔ محبت کا جذبہ جب وسعت اختیار کرتا ہے تو قوم کی محبت اور پھر انسانیت کی محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی جذبہ ہے جس کے شجر سے انسانی زندگی کو حُسن اور دوام بخشنے والی خصوصیات اور اقدار مثلاً اخلاص، مروت، رواداری وغیرہ کے اکھوے پھوٹتے ہیں۔ فیضؔ کے دل میں جب محبت کا شجر پروان چڑھا اور اس کے سائے دور دور تک پھیلنے لگے تو وطن دشمن اور انسانیت دشمن استحصالی طبقے فیضؔ کے دشمن بن گئے۔ فیضؔ کی ذات ان کے ظلم وستم کا نشانہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض کے دل میں جو شجر تھا وہ درد کا شجر بن گیا۔ محبت نے انہیں درویشانہ بلکہ میں تو کہوں گا کہ پیغمبرانہ صفات بھی بخشی تھیں۔ وہ قلب ونظر کی وسعت، ہمدردی، مروّت، نرمی، رواداری، غرضیکہ حُسنِ اخلاق کی تمام صفات کا پیکر تھے۔ دوست تو دوست، دشمن بھی ان کی صفات کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ فیضؔ کے دشمن بہتان تراشی کرتے اور خواہ مخواہ کیچڑ اچھالتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی کسی کو جواب نہیں دیتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جھوٹ کی دھول کتنی ہی اڑائی جائے، سچ آخر عیاں ہو کر رہتا ہے۔

شعر وادب کا موجودہ دور فیضؔ کا دور ہے۔ جن معروضی حالات نے فیضؔ اور ان کی شاعری کو جنم دیا تھا وہ ابھی نہیں بدلے ہیں اور شاید ایک عرصے تک نہیں بدلیں گے۔ انہوں نے اپنے مخصوص غنائی انداز اور روایتی پیرائے میں جدید دور کی حسیت کی ترجمانی کا فرض انجام

دیا۔ پاکستان بننے کے بعد جب فوجی سازش کرنے والوں کے ساتھ بے گناہ ترقی پسندوں کو بھی ملوث کیا گیا، فیضؔ صاحب کو جیل بھیج دیا گیا اور ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم پر بھرپور حملہ کیا گیا، تو متوسط طبقے کے بڑے بڑے معتبر ترقی پسند ادیب و شاعر اصولوں پر سمجھوتہ کر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے لیکن فیضؔ نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور تنظیمی انتشار کے باوجود ترقی پسند تحریک کو زندہ رکھا۔ فیضؔ نے نئے ادیبوں اور نئی نسل کو یہ پیغام دیا کہ ''آدمی کی اپنی ذات اتنی اہم نہیں، جتنے کہ انسانیت کے تقاضے ہیں۔ انسانیت کے جو مسائل درپیش ہیں انہیں حل کرنے کی کوشش کریں۔''

گو فیضؔ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ تنقید ان کا میدان نہیں تھا لیکن فیضؔ نرے شاعر بھی نہیں تھے۔ ادبی مسائل اور رجحانات پر ان کی نگاہ تھی۔ معاشرہ، سیاست، سائنس، نفسیات ہر ایک ان کے مطالعے کا محور تھے۔ برصغیر اور دنیا کے حالات و کوائف سے وہ باخبر تھے۔ شاعر کے لیے عالم فاضل ہونا شاید ضروری نہ ہو لیکن علم اور شعور کے بغیر اچھی اور بڑی شاعری کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ فیضؔ کو شاید دن رات یک گونہ بے خودی محبوب ہو لیکن وہ دن رات محض فکرِ سخن میں محو نہیں رہتے تھے۔ وہ کل وقتی شاعر ہرگز نہیں تھے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ادبی اور غیر ادبی مسائل اور مطالبات سے واقف رہنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ فیضؔ مزاجاً کم گو تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ انہیں غور و فکر کے لیے زیادہ وقت میسر تھا۔ یہ بات ہم اس لیے اور بھی کہہ رہے ہیں کہ اپنے قیامِ بیروت کے دو سال اور پھر اس کے بعد کے دو برس جب ہم ہر ماہ بیروت کا پھیرا لگاتے تھے، ہم نے تو یہ دیکھا کہ فیضؔ صاحب نے شاعری کے مقابلے میں نثر نگاری زیادہ کی جس کا ثبوت ان کے قیامِ بیروت کے دوران کی جانے والی شاعری پر مشتمل مجموعہ ''مرے دل مرے مسافر'' ہے جس میں محض اکتیس (۳۱) نظمیں اور غزلیں درج ہیں۔ فیضؔ ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر رہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء۔۱۹۳۵ء میں جب وہ ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرار تھے تو محمود الظفر وہاں پرنسپل تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بنے بھائی (سجاد ظہیر) سے بھی ان ہی دنوں روابط قائم ہوئے۔ اس طرح فیض احمد فیضؔ بھی ترقی پسند ادبی تحریک کے ابتدائی مبلغوں میں ہیں۔ یہاں بات چونکہ فیضؔ صاحب کی نثر نگاری کے حوالے سے ہو رہی ہے لہٰذا ہم ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے ان کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کرنا چاہیں گے جو ان کے مخصوص، نرم رو، ترنمی لہجے میں ہے:

''ترقی پسند ادیب ان اہم تجربات کو ترجیح دیتا ہے جن کے بیان اور تجزیے سے ترقی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے موضوعات پر کوئی قید عائد کر دی گئی ہے۔ وہ ذاتی اور اجتماعی، بنیادی اور فروعی، اہم اور غیر اہم بھی قسم کے تجربات کر سکتا ہے بہ شرطیکہ وہ ان میں کوئی نہ کوئی ترتیب ملحوظ رکھے اور پڑھنے والے ان کی اہمیت اور غیر اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔ تجربات تخلیق نہیں کیے جا سکتے، لیکن ان میں انتخاب تو کیا جا سکتا ہے اور ہم ترقی پسند ادیب سے صرف اتنا ہی تقاضہ کرتے ہیں کہ ان کا انتخاب گمراہ کن نہ ہوتا کہ اس کے پڑھنے والے زندگی کے اہم مسائل کو بھلا کر غیر ضروری تفصیلات میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔''

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے موضوعات ہیں جو ''گمراہ کن'' ہیں اور جن کا تعلق ''زندگی کے اہم مسائل'' سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں جب ہم نے فیض صاحب سے نشان دہی چاہی تو انہوں نے فرمایا: ''یہ ایک ہی تجربہ کئی طرح سے بیان ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ٹی پارٹی میں محض رومانی چھیڑ چھاڑ بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ کندۂ ناتراش امراء کی ذہنیت کا نقشہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے سماجی تعلقات کا کھوکھلا پن بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ماحول اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ آپ اسے قبول کر لیں اور اس طرح بھی کہ آپ اس کے خلاف بغاوت کریں۔ ترقی پسند ادیب اگر اپنے ماحول کو تسلی بخش سمجھتا ہے تو پہلا پیرایہ اختیار کرتا ہے، غیر تسلی بخش خیال کرتا ہے تو دوسرا۔''

ایک مرتبہ فیض صاحب سے ادب میں جمالیات کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے ادب میں جمالیات اور افادیت کے باہمی رشتے پر بڑی خوبصورت بات کہی۔

کہنے لگے: ''اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے تو آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی افزائش بجائے خود سماجی زندگی کی آسودگی اور بہتری میں اضافہ کرتی ہے یا دوسرے الفاظ میں حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں افادی فعل بھی ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو، جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، اس سے تزکیۂ نفس ہو، جو ہماری روح کو مترنم کرے،، اس کی رو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو، صرف حسین ہی نہیں، مفید بھی ہے۔ اسی وجہ سے جملہ غنائیہ ادب، بلکہ تما

اچھا آرٹ ہمارے لیے قابلِ قدر ہے۔ یہ افادیت محض ایسی تحریروں کا اجارہ نہیں جن میں کسی دور کے خاص سیاسی یا اقتصادی مسائل کا براہِ راست تجزیہ کیا گیا ہو۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کسی شاعر کا کلام جمالیاتی تاثر کے اعتبار سے ناقص ہے تو یہ نقص اس کی افادیت پر بھی اثر انداز ہوگا۔ ایسا کلام نہ صرف فنی جمالیاتی اعتبار سے حقیر ہوگا بلکہ اس کی افادیت بھی مشکوک ہوگی اور اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ محض مزدور، کسان، امن یا ایسا ہی کوئی دوسرا عنوان یا مضمون دوسری خوبیوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا واحد ضامن نہیں ہوسکتا۔''

ہوسکتا ہے غیر ترقی پسندوں یا ادب برائے ادب پر اصرار کرنے والوں کو شاید فیض صاحب کی اس گفتگو سے اختلاف ہو لیکن فیض کو اپنے ترقی پسندانہ کردار کا پورا احساس ہے۔

انہوں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: ''اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے، اگر آپ جمالیاتی قدر کی ''سماجیت'' کو تسلیم کرتے ہیں تو لامحالہ آپ کو یہ بھی ماننا ہوگا کہ نہ صرف اس قدر کے مقصود کو دوسرے اہم سماجی مقاصد سے الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس قدر کے نقش و نگار سماجی حقیقتوں کے گوشت پوست ہی پر ابھرتے ہیں۔ شعر کی حقیقت سے بے تعلقی کچھ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی حسین چہرہ اپنے جسم سے پیوست نہ ہوا۔ چنانچہ اپنے زمانے کی اہم سماجی حقیقتوں کا احساس اور ادراک اور ان کا موزوں اور مؤثر اظہار شعر کی افادیت ہی میں اضافہ نہیں کرتا، اس کی جمالیاتی قیمت بھی بڑھاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے موزوں اور صحت مند جسم کسی حسین چہرے کو سہارا ہی نہیں دیتا، اس کے حسن کا ایک لازمی جزو بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ہم ایک حساس اور ذکی شاعر سے نہ صرف سماج اور انسانیت کی بہتری کے لیے ہی نہیں بلکہ فن اور جمالیات کے فروغ کی خاطر بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم عصر زندگی کی صحیح قدریں پہچانے اور انہیں پہچاننے میں دوسروں کی رہنمائی کرے۔ اسی وجہ سے امن، آزادی، حب الوطنی، سلطانی جمہور، موجودہ زمانے میں ہماری شاعری کے اہم موضوع ہونا چاہئیں اور ہیں۔ اسی وجہ سے شعر و ادب کو آزادی، راحت اور آسودگی کے لیے نوعِ انسانی کی عالمگیر جدوجہد سے صرف علیحدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ شعر و ادب کی نمو اسی میں ہے کہ اس کارزار میں شاعر اور ادیب صحیح طرف ہوں۔''

فیض صاحب کی اس گفتگو کا اگر ہم خلاصہ کریں تو:

(۱) شعر کی جمالیاتی قدر کافی حد تک شاعری کی دوسری قدروں پر منحصر ہے۔

(۲) ان قدروں کی ترتیب ان کی سماجی اہمیت کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۳) جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے، جو اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتی ہے، اس لیے اسے دوسری افادی قدروں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں۔ اس لیے مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر ہی نہیں زندگی کے معیار پر بھی پورا اترے۔ یعنی خود فیض کی اپنی شاعری کے لیے وجہِ جواز:

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر، کیا کیجے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے

اصل میں ترقی پسندوں سے غلطی یہی ہوئی کہ انہوں نے اپنے ادب کو زندگی کے معیار پر پورا اتارنے کی کوشش تو کی لیکن اکثر وہ فن کے معیار پر پورے نہ اتر سکے۔ ادب کی جمالیاتی قدریں اس حد تک انہیں مرغوب نہیں رہیں۔ جتنی کہ اس کا افادی پہلو۔ کاش فیض ایک مخصوص دور کے شاعر کے منصب سے زیادہ دوامی اقدار کی حامل شاعری کے منصب کی باتیں کرتے۔ یہی بات جب ہم نے دورانِ گفتگو ان سے کہی تو وہ گویا ہوئے۔ ''ادب کی طرح تنقید بھی وقت اور ماحول کی پیروی کرتی ہے۔ ادبی کتابیں پہلے لکھی جاتی ہیں' تنقیدی قوانین بعد میں وضع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر دور کے نقادوں کو اپنے ہم عصر ادباء میں جو خصوصیتیں نظر آتی ہیں، انہیں کو وہ محاسن قرار دے لیتے ہیں اور پھر انہیں کو سامنے رکھ کر تنقید کے قواعد وضوابط بھی مرتب کر لیتے ہیں۔ جب معاشی ماحول بدلتا ہے تو لکھنے والے بھی بدل جاتے ہیں اور نقاد کی آراء بھی۔''

ہم نے عرض کیا فیض صاحب! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ادب کا کوئی مستقل پیمانۂ تنقید نہیں ہے، یعنی ایک ایسا پیمانۂ تنقید جس کا اطلاق بہ یک وقت۔ مثال کے طور پر میر، غالب اور اقبال پر ہو سکتا ہو اور ان کی شاعرانہ اہمیت اور عظمت کے اسباب وعوامل کا تجزیہ اور تعین کر سکتا ہو۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی شاعری جو اپنے جذبے، فکری عوامل اور لفظیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہے، انہیں پرکھنے کے پیمانے کیا ہوں گے۔ کیا میر کو پرکھنے کے لیے

مختلف پیمانۂ تنقید ہوگا اور غالب کو پرکھنے کے لیے مختلف؟ کیا ہر دور کے تنقیدی اصول مختلف ہوتے ہیں اور اپنی دور کے مخصوص معاشی، سیاسی اور سماجی مزاج کو سامنے رکھ کر متعین کیے جاتے ہیں؟

فیض صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے فرمایا: ''ابھی ترقی پسندوں کا زیادہ زور ترسیل اور ابلاغ پر رہا ہے۔ وہ عوامی ادب تخلیق کرنے کی سعی اور عوام تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اکثر مانوس پیرایۂ اظہار کو اپنایا۔ مروجہ اور مانوس ادبی ہیتیوں سے انحراف کرنے کی کم ہی کوشش کی۔ ۱۹۳۶ء میں سردار جعفری نظم معرا کے مخالف تھے۔ سجاد ظہیر نے تو اس کے کئی سال بعد ۱۹۴۴ء میں بھی آزاد اور معرا نظم کی مذمت کی اور انہیں ''شیر خوار تجربے'' سے تعبیر کیا۔ ادھر میں بھی اس کے حق میں نہیں ہوں۔ اب دیکھیں نا کہ عبدالحلیم شرر، علی حیدر طباطبائی اور زمانۂ حال کے چند شعرا نے بلینک ورس یعنی بے قافیہ نظموں کو رواج دینا چاہا۔ پنجاب کے اختر شیرانی اور ن۔م۔راشد نے چند ایک خوبصورت سانیٹ لکھے، جو اس سلسلے میں سب سے تازہ تجربہ تھا۔ یہ دونوں تجربے، انتہا پسندی پرمبنی تھے۔ اسی لیے کلی طور پر کامیاب نہیں ہوسکے۔ غالباً ہماری زبان ابھی بلینک ورس کی آزادی اور سانیٹ کی بندشوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ہمیں ایک درمیانی راستے کی ضرورت ہے جو نہ زیادہ نامانوس ہو، نہ جذبات کے اظہار میں رکاوٹیں پیدا کرے۔ چنانچہ آج کل بہت سی نظموں میں پرانی روایات اور جدید اختراعوں کے مابین ایک قسم کا سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

ہم نے عرض کیا: ''فیض صاحب شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے بھی قافیوں کی ترتیب میں آزادی ضرور برتی ہے لیکن ''بالکل بے قافیہ'' اور ''مکمل آزاد'' نظمیں شاذ ہی لکھی ہیں۔ بلکہ بقول آپ ہی کے الفاظ میں ''پرانی روایات اور جدید اختراعوں کے مابین ایک قسم کا سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی پچھلے ہفتہ ہی یہاں بیروت میں آپ نے مجھے اپنی جو تازہ نظم ''یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے'' سنائی تھی اس میں تو یہ ''سمجھوتہ'' دور دور تک نظر آتا!'' ہماری اس بات پر فیض صاحب زیرِ لب مسکرائے اور ہمارے ذہن میں ان کی نظم گونجنے لگی:

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا

وہ جا لگی ہے افق کنارے

اداس رنگوں کی چاندنیا
اتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھو یا
تمام تارے
اکھڑ گئی سانس پتیوں کی
چلی گئیں اونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکم خامشی کا
تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر
اور اِس بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نزاس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

یہ وقت آئے تو بے ارادہ

کبھی کبھی میں بھی دیکھتا ہوں

اتار کر ذات کا لبادہ

کہیں سیاہی ملامتوں کی

کہیں پہ گل بوٹے الفتوں کے

کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی

کہیں پہ خونِ جگر کے دھبے

یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا

یہ مہر ہے یارِ مہرباں کی

یہ لعل لب ہائے مہوشاں کے

یہ مرحمت شیخِ بدزباں کی

یہ جامۂ روز و شب گزیدہ

مجھے یہ پیراہنِ دریدہ

عزیز بھی، ناپسند بھی ہے

کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت

کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو

کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت

کہ چوم کر پھر گلے لگا لو

فیض نے اپنے تمام مضامین میں کئی مسائل و مباحث پر اظہارِ خیال کیا ہے، یعنی جو ان دنوں زیرِ بحث تھے۔ عموماً انہوں نے ایک اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ جو فیض کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اشاریت اور علامت کے تعلق سے وہ میراجی اور اس قبیل کے دوسرے شعراء کے رویے سے متفق نہیں۔ انہیں درمیانی راستہ پسند ہے۔

ایک دن فرمانے لگے:

''شعرا کی نئی پود ان پیچ در پیچ الجھنوں کو شعر میں ڈھالنے کے لیے بالکل نئی علامات کی فکر میں ہے۔ ان میں سے بعض کی علامات اتنی داخلی ہوگئی ہیں کہ سوائے ان کے دوسروں کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے تجربات میں کوئی بات ضرور مشترک ہونی چاہیے ورنہ ظاہر ہے کہ شعر کا پہلا مقصد یعنی ترجمانی فوت ہوجائے گا۔ یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ شاعر کی علامات ایسی دور از کار نہ ہوں کہ پڑھنے والا انہیں کسی تجربے یا تصور سے متعلق ہی نہ کر سکے۔ چنانچہ بعض شعرا نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ان کی علامات داخلی اور تمثیلی ضرور ہیں لیکن بعید از قیاس بھی نہیں۔ ان میں راشدؔ غالباً سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ تیسرے گروہ میں وہ شعرا ہیں جو اپنے کو ترقی پسند کہتے ہیں۔ ان میں مجازؔ، مخدومؔ، جعفریؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ شاعری کو عام فہم اور سلیس بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے اوّل تو ان کے ہاں علامات کی زیادہ بھرمار نہیں اور جو علامات ہیں، روزمرّہ کے قریب ہیں۔''

فیضؔ صاحب جب بھی اپنے ہم عصر شعرا کی بات کرتے، تو میں دیکھتا تھا کہ وہ ن۔م۔راشدؔ کی شاعری کے بہت قائل نظر آتے اور ان کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت سے کرتے تھے لیکن مجھے تعجب تب ہوتا کہ وہ نظم طباطبائی وغیرہ کی بے قافیہ شاعری اور راشدؔ کی سانیٹ نگاری کو انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن راشدؔ کی آزاد نظموں کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں!

آخر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا: فیضؔ صاحب ایسا کیوں ہے!؟

کہنے لگے: ''نوجوانوں پر راشدؔ کو فوقیت حاصل ہے۔ کچھ اس لیے کہ ان کی شاعری، اُس دور کے نوجوانوں کی ذہنی کاوشوں کا بہترین آئینہ ہے اور کچھ اس لیے کہ انہوں نے طرزِ بیان میں ایک نیا اور نہایت کامیاب تجربہ کیا۔ راشدؔ نے نئے اور پرانے اسالیب کو نہایت خوش اسلوبی سے یک جا کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اشعار آزادی اور لچک کے باوجود ترنم یا ہم آہنگی نہیں کھونے پاتے۔ مثال کے طور پر میں آپ کو راشدؔ کی ایک نظم کا بند سناتا ہوں:

تجھ سے اک شاعرِ درماندہ کی امید نہ تھی

مجھ سے جس روز ستارہ ترا وابستہ ہوا

تو سمجھتی تھی کہ اک روز مرا ذہنِ رسا

اور مرے علم و ہنر

تیری زینت کو گہرلائیں گے

میرے رستے میں جو حائل ہوں ترے تیرِ نصیب

کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں۔

جب فیض صاحب راشد کی نظم کا بند سنا چکے تو ہم نے پوچھا: میرا جی کی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ہمارے اس سوال کو سن کر وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش رہے پھر بولے: '' بھئی میں اُن کی حد سے بڑھی ہوئی داخلیت پسندی کو نامعقول سمجھتا ہوں۔ان کی علامات دن بہ دن ذاتی اور داخلی ہوتی جارہی ہیں جس کی ایک مبالغہ آمیز مثال میرا جی کا ایک مصرعہ ہے، جو افسوس ہے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔شاید انہوں نے کچھ یوں کہا ہے:

چل پڑا آیا کہیں کا، کالا کلوٹا کوّا

یہاں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاعری کی محبوبہ سو رہی ہے۔سونے میں کاجل رخسار تک بہہ آیا ہے اور اس کے ڈھلکے ہوئے کاجل کی صورت کچھ کوّے کی سی ہوگئی ہے۔چنانچہ انہوں نے کوّے سے یہ کاجل مراد لیا ہے۔ظاہر ہے کہ اتنی دور کی کوڑی لانا ہر پڑھنے والے کے بس کا روگ نہیں۔''

اس مرتبہ ہم نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا: فیض صاحب! میرا جی کی نثر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کہنے لگے: ''ان کی نثر کی ماہیت اور فضا ان کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔میرا جی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے، بعض اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی قریب قریب مکمل نفی ہے۔ان مضامین کی نکھری ہوئی شفاف سطح پر ان مبہم سایوں اور غیر مجسم پرچھائیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، جو ان کے شعر کی امتیازی کیفیات ہیں۔ان کی تخلیق کا یہ حصّہ تمام تر اسی پاسبانِ عقل کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے، جسے وہ محملِ شعر کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ایک حد تک تو خیر شعر اور دلیل میں یہ فرق ناگزیر بھی ہے لیکن میرا جی کی تحریروں سے یہ صاف عیاں ہے کہ انہوں نے تنقیدی جانچ پرکھ کے لیے جذب و وجدان کے بجائے عقل و شعور کا انتخاب مجبوری سے نہیں، پسند

اور ارادے سے کیا ہے۔ مختلف ادوار، اقسام اور اطراف کے ادب کی تفسیر، تفہیم اور تنقید میں وہ خالص عقلی اور شعوری دلائل و شواہد سے کام لیتے ہیں۔ موہوم داخلی کشش و اکراہ کا کہیں سہارا نہیں لیتے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ اگر ان مضامین کے تنقیدی مسلک اور عقائد کی روشنی میں میرا جی کی شاعری کا مکرّر مطالعہ کیا جائے تو شاید اس کے بعض پہلو رائج تصورات سے مختلف نظر آئیں۔''

فیضؔ صاحب کے تنقیدی شعور، کشادہ دلی اور گہری نظر کے ساتھ لکھے ہوئے مضامین کے حوالے سے بیروت میں قیام کے دوران اکثر ان سے گفتگو رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ہم نے ان سے پوچھا کہ فیضؔ صاحب! تقسیم ہند سے چند سال پہلے جب جوشؔ صاحب ترقی پسندوں کے قبلہ و کعبہ تھے۔ ان کی شہرت اور عظمت نصف النہار پر پہنچی ہوئی تھی جبکہ آپ اُس وقت اپنی شہرت کے ابتدائی دور سے گذر رہے تھے۔ اس زمانے میں کلیم الدین احمد کے علاوہ کسی اور معتبر نقاد نے جوشؔ کی شعری کمزوریوں کی بابت دوٹوک انداز میں فیصلہ نہیں دیا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانے میں آپ نے بھی جوشؔ کی انقلابی نظموں کی خامیوں اور کوتاہیوں کی جانب توجہ دلائی تھی! یہ فرمائیے کہ آیا آپ نے بھی جوشؔ کی انانیت پسندی اور انفرادیت کی مدح سرائی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا؟

فیضؔ صاحب کہنے لگے: زلفی صاحب! بات اصل میں یہ ہے کہ اسے جوشؔ صاحب کا کمال کہہ لیجئے، یا کمزوری سمجھ لیجئے کہ انقلابی اور رندانہ شخصیتوں میں کوئی ربط یا علاقہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو اتنا نامحسوس کہ اگر ان کا کلام دو حصوں میں بانٹ دیا جائے تو سوائے اسلوب بیان کے، دونوں حصوں میں کوئی ذہنی یا جذباتی کیفیت مشترک نہیں، جبکہ اشتراکیت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ انقلاب کسی فرد یا کسی ایک شخص کی ذاتی کوششوں اور تدبر کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ سماجی اور اقتصادی قوتوں کی باہمی پیکار اور کش مکش سے نمودار ہوتا ہے۔ اس انقلاب میں فرد کی اہمیت طبقوں یا جماعتوں کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جوشؔ کی شاعرانہ طبیعت اور مزاج اس نظریے کے خلاف ہے۔ وہ طبعاً انانیت پسند اور انفرادیت کے مدّاح واقع ہوئے ہیں۔ جب وہ انقلابی تگ و دو کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور سے اس تگ و دو کا ہیرو کوئی طبقہ نہیں بلکہ فرد ہوتا ہے اور ان کے ابتدائی انقلابی کلام میں یہ ہیرو جوشؔ صاحب خود ہی ہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ان کا ایک شعر سناتا ہوں:

ہٹ، کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں

خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں، چھا جاتا ہوں میں

فیضؔ کی تنقید، صاف، رواں اور شستہ نثر کا بھی نمونہ ہے۔ ان کی تنقید سے افہام و تفہیم کے دریچے وا ہوتے ہیں اور ان کی نثر سے ایک خاص طرح کی ذہنی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اب چونکہ وہ کوئی سکّہ بند نقاد تو تھے نہیں۔ کہیں کہیں ان کا بے تکلفانہ غیر رسمی لہجہ تحریر کی شگفتگی کو دو بالا کر دیتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ فیضؔ کے تنقیدی مضامین، انہیں باقاعدہ ناقد کا درجہ تو نہیں دیتے لیکن ان کے تنقیدی شعور کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں اور یہ بات خود فیضؔ صاحب نے بار ہا مجھ سے بھی کہی کہ میرے تنقیدی مضامین میں تخاطب علماء سے نہیں بلکہ عام پڑھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔

سماجی عمل اور تخلیقی عمل میں ایک بنیادی فرق ہے۔ سماجی عمل بالعموم برسرِ عام اور تخلیقی عمل تنہائی میں ہوتا ہے۔ سماجی عمل کا بنیادی تعلق باہر کی دنیا سے ہوتا ہے اور تخلیقی عمل کا بنیادی تعلق اندر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ سماجی عمل کی سمت پورے سماج کی فلاح و بہبود کی طرف ہوتی ہے یا کم از ہونی چاہئے جبکہ تخلیقی عمل افراد کے ذریعے سماج کے آہنگ و توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش ہوتا ہے جو سارے انسانوں میں مشترک ہوتی ہے۔ منفرد انسانوں کے روحانی کرب، باطنی احتیاجات، ان کے خوابوں اور وجدان و تخیل کے تقاضوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تخلیقی عمل کا تعلق وجدان و تخیل کے ذریعے موجود صورتِ حال سے ماوراء ہونے اور ناموجود کو تبدیل کر کے نئے عالم کی تخلیق پر مصر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہی وہ صورتِ حال ہے جس میں تخلیقی عمل سماج کے ان مقتدر عناصر کے لیے جو موجود صورتِ حال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ چیلنج بن جاتا ہے۔ سماج کی تخلیق دشمنی اور تخلیقی عمل سے خوفزدگی کا یہی بنیادی سبب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی فیضؔ کا فلسفہ بھی ہے۔ ان کے نزدیک ہر عمل کے پیچھے میلانات، رجحانات اور ان سے پیدا شدہ روّیے موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے اور انہیں تبدیل نہ ہونے دینے کے ہوں تو تخلیق سے خوفزدگی فطری بات ہوگی۔ تخلیقی عمل محض شعر و ادب یا فنونِ لطیفہ کی تخلیق تک محدود نہیں ہے۔ تخلیقی روّیوں کی کارفرمائی زندگی کے ہر شعبے اور عمل میں ہوسکتی ہے۔ آپ کے چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی کاموں میں بھی یہ روّیے

محسوس کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ موجود کو بہتر اور خوبصورت بنا کر اس کی قلب ماہیت کرنے اور زندگی کو خوبصورتی اور توانائی بخشنے کے لیے ہوں، نیز یہ کہ زندگی کے فطری آہنگ کے مطابق ہوں۔ اس تخلیقی عمل کے دو رخ ہوتے ہیں۔ آپ جس قدر حسن، توازن اور آہنگ باہر کی دنیا میں پیدا کریں گے۔ اسی قدر حسن، توازن اور آہنگ آپ کی ذات میں، آپ کے باطن میں پیدا ہوگا۔ تخلیقی عمل کا بنیادی اصول یہی ہے اور اگر آپ اپنی ذات میں، حسن، توازن اور آہنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اسے زندگی کے عام کاموں میں بھی برتئے۔ لہذا تخلیقی عمل کے پیچھے جو رویے کارفرما ہوں گے، وہ موجود صورتِ حال کو تبدیل اور اس کی قلب ماہیت کرنے والے ہوں گے۔ آپ کے تخلیقی عمل سے اشیاء اور معروض (جن میں انسان بھی شامل ہیں) موجود صورت کو چھوڑ کر اعلیٰ تر صورت اختیار کریں گے اور زندگی کے حسن اور اس کی توانائی میں اضافہ کریں گے۔ جس کی ایک اعلیٰ مثال ہم فیض احمد فیضؔ کی زندگی اور ان کے فن پاروں میں دیکھتے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں امریکا، اسرائیل اور مصر کی باہمی مشاورت سے Camp David معاہدہ طے پایا جس کی رُو سے غزہ کی مغربی پٹی میں فلسطین کی خود مختار حکومت قائم ہونا تھی لیکن اس معاہدہ پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ اس طرح PLO کی جانب سے فلسطین کی خود مختار اور آزاد ریاست کے قیام کی مانگ میں شدت آ گئی PLO کے چیئرمین یاسر عرفات کی سرگرمیوں میں بجلیاں بھر گئیں۔ اپنے اس حق کے حصول کے لیے انہوں نے ایشیائی اور افریقی ممالک سے روابط قائم کرنا شروع کیے۔ اس ضمن میں پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ ''لوٹس میگزین'' کا صدر دفتر قاہرہ سے بیروت منتقل کیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیضؔ کو بیروت بلا کر اس رسالہ کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کی اور خود بھی اپنے تنظیمی کاموں سے وقت نکال کر رسالہ کی سرپرستی کرتے رہے۔

ان ہی دنوں ہم نے فیضؔ صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم چیئرمین یاسر عرفات سے ملنا چاہتے ہیں۔

کہنے لگے ٹھیک ہے۔ اگلی بار جب وہ ہمیں ملاقات کے لیے بلائیں گے تو ہم آپ کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

معمول کے مطابق ایک اتوار کو ہم فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔

کہنے لگے: بھئی آنے والے بدھ کو دو بجے یاسر عرفات صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔ یہی رسالے کے سلسلے میں کچھ امور پر بات کرنی ہے۔ اگر آپ اپنی پڑھائی کے دوران یونیورسٹی سے چند گھنٹے نکال سکتے ہیں تو ''ابو عمار'' سے ملاقات کی اپنی آرزو پوری کر لیجئے۔

ہم نے ہامی بھرلی۔ البتہ ایک دشواری تھی، جس کا ہم نے فیض صاحب سے قطعی ذکر نہ کیا۔ ورنہ وہ ہمیں روک دیتے اور وہ یہ کہ بدھ کو ہمارا بہت اہم ٹیسٹ تھا۔ اپنے پروفیسر سے بات کی کہ زندگی میں پہلی بار ہمیں چیئرمین یاسر عرفات سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے اگر وہ ہمیں ٹیسٹ جمعرات کو لکھنے کی اجازت دیدیں تو ہماری یہ خواہش پوری ہوسکتی ہے۔'' جارج وکٹر ''نہایت شفیق استاد تھے، انہوں نے ہمیں اجازت دیدی۔

مقرّرہ دن ہم فیض صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ جہاں سے PLO کی گاڑی ہم دونوں کو تنظیم کے ہیڈ کواٹر لے گئی۔

شارع الحمراء سے متصل ایک وسیع احاطے میں ایک پرانی سی سفید عمارت، جس کی چھت سبز کھپریل کی بنی ہوئی ہے۔ احاطے کے گیٹ پر دونوں جانب لکڑی کے کیبن میں دو بندوق بردار مستعد سیکیورٹی گارڈ ہماری گاڑی جب گیٹ پر پہنچی تو کیبن سے ایک پہرے دار برآمد ہوا، جس نے گاڑی کے اندر منہ ڈال کر ہم دونوں کو بغور دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور نے ہمیں عمارت کے مرکزی دروازے پر اتارا۔ عمارت کے اندر ہماری رہنمائی کرتا ہوا ریسیپشن (استقبالیہ) تک لے گیا جہاں بیٹھی ہوئی خاتون کو بتایا کہ یہ لوگ ابو عمار کے مہمان ہیں۔ خاتون سے عزت واحترام کے ساتھ ہمیں بٹھایا اور قہوہ پیش کرتے ہوئے نہایت تہذیبی اور روایتی انداز میں کہا: ابو عمار کے پاس کچھ لوگ کافی دیر سے بیٹھے ہیں۔ بس اب نکلا ہی چاہتے ہیں۔ آپ قہوہ لیجئے۔ یہ کھجوریں تناول فرمائیے۔ آپ نے یہاں تشریف لاکر ہمیں عزت بخشی۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ فیض صاحب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔ یہاں تک کہ استقبالیہ پر بیٹھی خوبصورت لبنانی خاتون کو دیکھ کر بھی ان کے مزاج کی حسن پرستی خوابیدہ رہی۔ ہونٹوں پر وہ لطیف مسکراہٹ نہ آئی جو ان کی شخصیت کا حصّہ ہے۔

ہم نے آہستہ سے اردو میں کہا: فیض صاحب یہ کہہ رہی ہے کہ ابو عمار نے آپ کو یہاں سے

الجزائر منتقل کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ شاید آپ کو کل ہی روانہ ہونا پڑے۔

فیض صاحب نے چونک کر ہمیں دیکھا اور بولے: مطلب؟

ہم نے عرض کیا: بیروت کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے ہیں نا لیکن یہ کہتے ہوئے ہم اپنی ہنسی کو نہ ضبط کر سکے۔ آخر فیض صاحب بھی ہنس دیے۔ ایک لطیف مسکراہٹ ان کے لبوں پر انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔

کچھ ہی دیر بعد یاسر عرفات اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد ہم لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ ہیک سلیک کے دوران فیض صاحب نے ہمارا تعارف کروایا اور کہا کہ یہ ہمارے نوجوان پاکستانی دوست ہیں۔ آپ کو قریب سے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یاسر عرفات نے محبت سے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اھـــــلا و سہلاً ۔ شرفتنا کہتے ہوئے اپنے آفس میں داخل ہوگئے۔

اب یاسر عرفات اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے، فیض صاحب ان کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھے اور ہم ذرا فاصلے سے رکھے ایک صوفے پر۔ ان دونوں کی یہ میٹنگ کوئی تیس منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران ہم وہاں رکھے عربی کے اخبارات اور رسائل دیکھتے رہے۔

یاسر عرفات عمر میں فیض صاحب سے ۱۹ سال چھوٹے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۶۴ء سے بطور کل وقتی انقلابی لیڈر برائے آزادئ فلسطین اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ ۲۴ راگست ۱۹۲۹ء کو قاہرہ میں جنم لینے والے اس مجاہد نے ۱۱ رنومبر ۲۰۰۴ء کو پیرس کے اسپتال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ وفات سے دس سال قبل یاسر عرفات کو ''نوبل امن ایوارڈ'' ۱۹۹۴ء میں دیا گیا۔

فیض صاحب سے انگریزی میں ضروری بات چیت کے بعد ابو عمار ہماری جانب متوجہ ہوئے۔ وہ اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں نظر آرہے تھے۔ ہم سے عربی میں مخاطب ہوئے۔ اُن دنوں بیروت میں ہمارے قیام کی غرض وغایت سے آگاہی حاصل کی۔ پوچھا بیروت کیسا لگا، آپ کو۔

ہم نے کہا: ہمارا بیروت آنا جانا تو گذشتہ دس سال سے جاری ہے۔ یہ خوبصورت شہر بلا مبالغہ شرق الاوسط کا پیرس ہے۔

یاسر عرفات کہنے لگے: فیض صاحب بتا رہے تھے کہ آپ بھی شاعر ہیں۔ میں شعراء کی بہت قدر کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے فیض صاحب کا تازہ کلام عربی میں ترجمہ کر کے سنائیں۔

ہم نے فیض صاحب کی جانب دیکھا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں اپنی ایک نظم ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'' سناتا ہوں۔ آپ اس کا عربی میں ترجمہ کر دیں:

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن

تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے

تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے

تیری الفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی

تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی

سارے ان دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا

کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا

دور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں

اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم

لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم

تیرے اعداء نے کیا ایک فلسطیں برباد

میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

نظم کے آخری دو مصرعے سن کر یاسر عرفات جھوم اٹھے۔ اسی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کر فیض صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ ہماری جانب گھوم کر کہنے لگے۔ ''الاخ زلفی! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ فیض صاحب کی وہ تمام نظمیں جو فلسطین اور اس کے مجاہدین کے تناظر میں کہی گئی ہیں۔ ان سب کا عربی میں ترجمہ لکھ کر مجھے بھجوا دیں۔''

ہم نے کہا کیوں نہیں یا ابو عمار! یہ تو ہمارے لیے بیحد اعزاز کی بات ہوگی۔

یاسر عرفات کا یہ ذوقِ شعری دیکھ کر ہم نے جھجکتے ہوئے کہا: کیا آپ بھی شعر کہتے ہیں؟

بولے: نہیں، البتہ مجھے شعر بہت یاد ہیں۔

اس دوران فیضؔ صاحب جو ہم دونوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں اردو میں بتایا کہ ابوعمار کو آپ کی نظم بہت پسند آئی ہے۔۔ ان کی خواہش ہے کہ میں آپ کی وہ تمام نظمیں جو فلسطین اور اس کے مجاہدینِ آزادی کے تناظر میں کہی گئیں ہیں عربی میں ترجمہ کر کے انہیں بھجوادوں، جسے یہ یہاں کے عربی جرائد و مجلات میں شائع کروانا چاہتے ہیں۔ انہیں عربی کے بہت سے شعراز بر ہیں۔

یہ سن کر فیضؔ صاحب نے یاسر عرفات سے درخواست کی کہ آپ بھی اپنی پسند کا کچھ کلام سنائیں۔ زلفی صاحب میرے لیے اس کا اردو ترجمہ کریں گے۔ اب چونکہ ابوعمار موڈ میں تھے اور فیضؔ صاحب کی نظم کا سرور قائم تھا۔ انکساری سے بولے: میں خود تو باقاعدہ شاعر نہیں ہوں البتہ کبھی کبھی تک بندی کر لیتا ہوں۔ میں آپ کو اپنے ان قدیم شعراء کے شعر سنا سکتا ہوں جو زبان زدِ عام ہیں۔ اس سے پہلے یہ بتانا چاہوں گا کہ ہماری عربی شاعری کی تاریخ کوئی ساڑھے پندرہ سو برس پرانی ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کی زندہ زبانوں کی شاعری میں اگر یہ سب سے قدیم ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ ہمارے مورخینِ ادب شاعری کی اس طویل روایت کو پانچ ادوار پر تقسیم کرتے ہیں۔ سب سے پہلا دور اسلام سے ذرا پہلے زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا ہے جس کے آثار اگرچہ رسول ﷺ کی بعثت سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے تک ملتے ہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے، عربی شاعری اُس زمانے میں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ادب کے نقادوں کے نزدیک کئی صدیوں تک عربی شاعری کا سب سے اعلیٰ و ارفع معیار وہی رہا ہے جو امرؤالقیس، زہیر اور نابغہ جیسے جاہلی شعراء نے ایک دفعہ قائم کر دیا تھا۔ صدیوں تک عربی شاعری کے دوسرے دور کو صدرِ اسلام دور اموی دور کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام کی آمد کا ایک فوری اثر یہ ہوا کہ اس کے پیغام اور قرآن کریم کی معجزانہ بلاغت کے سامنے عربی شاعری کی گرم بازاری کچھ عرصے کے لیے سرد پڑ گئی اور لوگوں کی توجہ شعر و سخن سے ہٹ کر آیاتِ قرآنی کے حسنِ بیان کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ نبی ﷺ اور ان کے خلفاء کے زمانے میں کچھ ایسی شاعری ضرور ہوئی جو

اسلام کی مدافعت اور رسولِ خدا کی مدح میں تھی۔ تاہم اپنے محاورے اور اسلوب میں یہ جاہلی شاعری سے مختلف نہیں تھی۔ بنوامیہ کا عہد شروع ہوتے ہی عربی شاعری میں پھر سے چہل پہل دکھائی دینے لگتی ہے۔ عربوں کے اندرونی نسلی، علاقائی اور سیاسی و اعتقادی عصبیتیں جو خلفائے راشدین کے زمانے میں دبی رہی تھیں جب رفتہ رفتہ ابھر کر نمودار ہونے لگیں، تو شعراء کی مانگ ہوئی۔ سخنورانِ عرب بادیہ سے نکل کر شہروں کا رخ کرنے لگے اور ہر طرف ان کی ریل پیل ہوگئی۔ اس عہد میں تین شاعروں، اخطل، فرزدق اور جریر نے بڑا نام پایا، اور اپنی بلاغت وزورِ بیان میں یہ جاہلی شعراء کے ہم پلہ ٹھہرے۔ عربی زبان کی خالصۃً عشقیہ شاعری کے بہترین نمونے بھی اسی عہد میں عمر ابنِ ربیعہ اور جمیل کے کلام میں ملتے ہیں۔ اور مشہورِ عالم رومانی داستان ''قیس ولیلیٰ'' (لیلیٰ مجنوں) کا قیس بھی اسی زمانے کا ایک حقیقی شاعر ہے۔ عربی شاعری کا تیسرا دور عباسی دور کہلاتا ہے، اسی نام کے سیاسی دور کی طرح یہ بھی کئی صدیوں پر پھیلا ہوا اور حوادث وتغیرات سے پُر ہے۔ ایک بڑی تبدیلی جو اس عہد کے آغاز سے ہی عربی شاعری میں واقع ہونے لگتی ہے، یہ ہے کہ اب شاعری اپنے مزاج میں خالصۃً عربی نہیں رہتی، بلکہ ایرانی اور دوسرے عجمی عناصر کے اختلاط سے اس پر بیرونی اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ شاعری کے مضامین جو پہلے سادہ، سچے اور فطرت کے قریب ہوا کرتے تھے، اب ان میں نفاستِ خیال اور مضمون آفرینی اور شہری زندگی کے اطوار دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر عباسی خلفاء اور امراء کی مدح اور ہجو میں نئے نئے مضامین پیدا کرنے لگتے ہیں۔ اس عہد میں کم از کم بارہ نام صفِ اول کے شعراء کے گنوائے جا سکتے ہیں، جن میں سے بعضوں کا نام آپ ایشیائیوں کے لیے بھی شاید اتنا نامانوس نہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ خاص کر آپ لوگ ہمارے شاعر ابوالعلاء معرّی سے بخوبی واقف ہیں۔ (یاسر عرفات اس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ قدیم عرب شعراء کی تاریخ بیان کر رہے تھے کہ کسی تعلیمی ادارے میں لیکچر دے رہے ہوں یا کسی سیمنار سے خطاب کر رہے ہوں) کہنے لگے میں آپ کو زہیر کے دو تین شعر سناتا ہوں:

وَمَن لم يذُد عن حوضِهِ بسلاحِهِ

يُهدّم و مَم لا يظلم الناس يظلم

(جو اپنی جان، آبرو کی حفاظت ہتھیار اٹھایا نہیں کرتا، وہ مسمار کر دیا جاتا ہے، اور جو دوسروں پر ظلم نہیں کر سکتا وہ خود ظلم کا نشانہ بن جاتا ہے)

ومن یغترب یحسب عدواً صدیقہ

ومن لایکرم نفسہ لا یکرم

(جو شخص اغیار سے رشتہ جوڑتا ہے، وہ گویا دشمن کو دوست سمجھتا ہے۔ اور جو اپنی عزت نہیں کرتا، دنیا اس کی بھی عزت نہیں کرتی)

و من یجعل المعروف فی غیر اھلہ

یکن حمدہ ذماً علیہ و یندم

(جو شخص کسی ایسے آدمی پر احسان کرتا ہے جو اس کا اہل نہیں ہوتا۔ تو اس کا یہ قابلِ تعریف فعل اس کے لیے مذمت بن جاتا ہے۔ اور وہ اس پر ایک دن نادم ہوتا ہے)

یاسر عرفات کی زبانی زہیر کا یہ شعر سن کر ہم نے عرض کیا: یا ابو عمار! اسی تناظر میں کسی دانا کا قول بھی تو ہے، تمہیں سب سے زیادہ خبردار اس شخص سے رہنا چاہیئے جس پر تم نے احسان کیا ہو۔ اس لیے کہ ایک دن وہ تمہیں ضرور ڈسے گا۔

ابھی ہم لوگوں کی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ استقبالیہ پر بیٹھی خاتون نے آ کر بتایا:

''یا ابو عمار! آپ کے کچھ اور ملاقاتی باہر بیٹھے باریابی کے منتظر ہیں۔''

یہ سن کر ہم نے فیضؔ صاحب کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے قہوہ کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے یاسر عرفات صاحب سے اجازت طلب کی۔ وہ ہمیں حسب روایت استقبالیہ کے دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ فیضؔ صاحب سے چند باتیں کیں۔ ہمیں عربی ترجمہ بھیجنے کی تاکید کی اور پھر اپنے دوسرے ملاقاتیوں میں گھر گئے۔

یاسر عرفات سے اس یادگار اور متاثر کن ملاقات پر ہم بہت خوش تھے۔ واپسی پر راستے میں فیضؔ صاحب نے بھی ابو عمار کی ذہانت کی بیحد تعریف کی۔ فیضؔ صاحب نے عربی ادب میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔

کہنے لگے: بھئی ہمیں عربی بولنے کی پریکٹس نہیں۔ سمجھ اچھی طرح لیتے ہیں۔ اب سے پہلے

جب بھی یاسر عرفات صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ہمیشہ ہم سے انگریزی میں بات کی اور شعر و ادب کے موضوع پر کبھی اظہارِ خیال نہ کیا لیکن آج آپ کی وجہ سے انہوں نے عربی میں جس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ عرب شعراء کا ذکر کیا ہے، وہ سن کر دل خوش ہوا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا، جب فیضؔ صاحب نے طے کیا ہو کہ ''جلاوطنی کے اس دوسرے پڑاؤ'' کی تمام شاعری کو ''ابو عمار یاسر عرفات'' کے نام معنون کریں گے۔ جب جلاوطنی کے زمانے کی وطنیہ شاعری کا مرقع فیض احمد فیضؔ کا ساتواں شعری مجموعہ ''مرے دل مرے مسافر'' منصۂ شہود پر آیا تو یاسر عرفات کا نام اس پر جگمگا رہا تھا۔

قیامِ بیروت کے چار سال کے دوران گو کہ فیضؔ صاحب دنیا بھر کے علمی، ادبی اور سماجی اداروں کی دعوت پر تسلسل کے ساتھ آتے جاتے رہے لیکن ہمارا ملنا جلنا، ان کے بیروت میں ایامِ اقامت ہی میں رہا۔ اسی طرح یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ یونیورسٹی میں چھٹی تھی۔ ہم فیضؔ صاحب کے دفتر جا دھمکے۔

وہ ہمیں یوں اچانک دفتر میں دیکھ کر قدرے حیرانی سے بولے: کیوں بھئی آج یونیورسٹی نہیں گئے!

ہم بتایا کہ آج چھٹی تھی تو سوچا آپ کو پریشان کیا جائے،

کہنے لگے: اچھا کیا جو آ گئے۔ ہمارا بھی آج کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔

ہم نے کہا: آیئے آج آپ کو ''الحمراء کافی ہاؤس'' کی کافی پلاتے ہیں۔

کافی ہاؤس کی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھنے کے بعد فیضؔ صاحب گویا ہوئے۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی دو ہفتے پہلے آپ نے ہمیں ایک مقامی اخبار لا کر دیا تھا جس میں غزّہ کی حالیہ اسرائیلی بمباری میں مرنے والوں میں شامل ایک ایسی فلسطینی عورت کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش کے سینے سے چمٹا اس کا دو سالہ زندہ بچہ رو رہا ہے۔''

''جی'' میں نے اُس تصویر کا سوچ کر، کرب سے کہا۔

فیضؔ صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولے: ہم نے اُسی فلسطینی بچے کے لیے ایک نظم ''فلسطینی بچے کے لیے لوری'' ابھی مکمل کی ہے۔ وہ آپ کو سناتے ہیں:

مت رو بچّے

رو رو کے ابھی

تیری امّی کی آنکھ لگی ہے

مت رو بچّے

کچھ ہی پہلے

تیرے ابا نے

اپنے غم سے رخصت لی ہے

مت رو بچّے

تیرا بھائی

اپنے خواب کی تتلی کے پیچھے

دور کہیں پردیس گیا

مت رو بچّے

تیری باجی کا

ڈولا پرائے دیس گیا ہے

مت رو بچّے

تیرے آنگن میں

مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں

چندرما دفنا کے گئے ہیں

مت رو بچّے

امّی، ابّا، باجی، بھائی،

چاند اور سورج

روئے گا تو اور بھی تجھ کو رلوائیں گے

تو مسکائے گا تو شاید

سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے۔

نظم سننے کے بعد اُس وقت جو ہماری جو کیفیت ہوئی۔ کرب کے اُن لمحات کو یاد کر کے اِس وقت بھی ہم پر وہی کیفیت طاری ہے۔ اندازہ کیجئے اُس تخلیق کار کے دل پر کیا گزری ہوگی جس نے یہ نظم تخلیق کی۔

فیض صاحب کو یاد دلایا کہ یاسر عرفات صاحب نے ہمیں پابند کیا ہے کہ فلسطین، فلسطینیوں اور فلسطین کے مجاہدین سے متعلق فیض صاحب کا تمام کلام عربی میں ترجمہ کر کے انہیں بھجواتے رہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کی یہ پُر اثر نظم ہمیں ترجمہ کر کے انہیں فوراً بھیجنی چاہیئے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ نظم ہمیں لکھوا دیں تا کہ اس کا عربی ترجمہ ہم ابو عمار کو بھیج دیں۔ فیض صاحب نے اس بات کو پسند فرمایا اور نظم ہمیں لکھوا دی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں آپ کہیں بھی جائیں وہاں آپ کو کچھ پاکستانی ضرور آباد ملیں گے یا نظر آئیں گے لیکن پھر بھی چند ایسے ممالک ہیں جہاں آپ کو شاید پاکستانی کبھی کبھی نظر تو آجائیں لیکن آباد نہیں ملیں گے۔ ان ممالک میں اسرائیل، فلسطین اور لبنان وغیرہ شامل ہیں۔ خاص کر ہم جو ۳۲ سال پہلے کی بات کر رہے ہیں جب فیض صاحب وہاں مقیم تھے۔ اُس زمانے میں تو اکا دکا پاکستانی بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اس بات سے آپ فیض صاحب کی تنہائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ البتہ بیروت میں پاکستانی سفارت خانے کا عملہ ضرور مقیم تھا لیکن ظاہر ہے وہ لوگ فیض صاحب کو جاننے، ماننے اور قدردان ہونے کے باوجود ان سے ملاقات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہر کسی کو اپنی ملازمت پیاری تھی! اس تمام صورتِ حال کے باوجود اگر کوئی ذمہ دار پاکستانی ڈپلومیٹ سفارت کار، خاموشی سے فیض صاحب کی قیام گاہ پر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ حاضری دے تو حیرت تو ہوتی ہی ہے!! یہی حیرت ہمیں اُس وقت ہوئی جب ہم معمول کے مطابق فیض صاحب کے فلیٹ میں بیٹھے کسی موضوع پر اُن کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے، اچانک بیل ہوئی۔ بیگم فیض نے دروازہ کھولا تو اپنے دروازے پر پاکستانی سفارت کار چوہدری اقبال احمد گوندل کو بریف کیس کے ساتھ کھڑا پایا۔۔ اور وہ انہیں اندر لے آئیں۔ اندر پہنچ

کر وہ فیضؔ صاحب سے گلے ملے۔ہم سے ہاتھ ملایا اور ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

رسمی مزاج پرسی کے بعد فیضؔ صاحب نے دریافت کیا: بھئی خیر تو ہے۔کیسے آنا ہوا۔کہنے لگے۔سر! ہماری طرف سے تو خیر ہی خیر ہے۔سرکاری ملازم ہیں اور حکومتِ وقت کے تابعدار بھی لیکن ذاتی حیثیت میں آپ کے قدر دان اور مداح ہیں۔

یہ سن کر فیضؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔

گوندل صاحب نے بریف کیس سے نو مطبوعہ انگریزی ناول Ashes and Embers (راکھ اور انگارے) پیش کیا۔

کتاب دیکھ کر فیضؔ صاحب بولے: اچھا۔ہاں۔یہ مجھے بذریعہ ڈاک بھی مل چکا ہے۔شاید آپ ہی نے بھجوایا تھا۔

وہ بولے: جی سر! کیسا لگا آپ کو میرا یہ ناول؟

فیضؔ صاحب نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے صوفے پر پہلو بدلا اور ہنستے ہوئے بولے۔ جناب آپ نے facts اور fiction کا قیمہ بناتے وقت تکنیکی لاعلمی کی ہڈیوں کا چورہ بھی ملا ڈالا۔بھائی! فکشن اور وہ بھی اُس ملک اور قوم کی زبان میں جس کے درمیان آپ رہے بھی نہیں جس کے کلچر اور جذبات سے آپ بالکل بے بہرہ ہیں۔گوندل صاحب! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ضرور ہے لیکن اردو میں لکھیں جو آپ کی قومی زبان ہے ورنہ پنجابی میں لکھیں، جو آپ کی مادری زبان ہے۔انگریزی ادب آپ کے اس ناول کا متحمل نہیں ہو سکتا۔اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کے بارے میں آپ نے قیامِ پاکستان سے قبل انگریزی میں جو معلوماتی کتاب لکھی تھی اُس کی بات اور تھی لیکن یہ انگریزی ادب آپ کے بس کا نہیں۔

فیضؔ صاحب کی اس صاف گوئی کے سبب گوندل صاحب کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔اصل میں وہ اگر اکیلے ہوتے تو کوئی بات تھی۔ہماری موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ پریشان تھے۔ہم نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فیضؔ صاحب سے رخصت چاہی۔

فیضؔ صاحب نے یہ کہتے ہوئے: بھئی گوندل صاحب ہمارے پرانے کرم فرما اور عزیز دوست ہیں اور یہ سب دوستی کی باتیں ہیں۔آپ بیٹھیں اور پریشان نہ ہوں۔اتنے میں چائے آ گئی اور

موضوع بدل گیا۔

اپنے قیامِ بیروت کے دوران ہی فیضؔ صاحب ۱۹۷۸ء کے اواخر میں پہلی بار کینیڈا بھی تشریف لائے تھے۔ایک دن کہنے لگے: بھئی آپ تو اپنی سالانہ تعطیلات میں ہر سال مہینے بھر کے لیے کینیڈا جاتے رہتے ہیں۔ذرا وہاں کا کچھ ادبی احوال تو سنائیے۔۔ہم نے عرض کیا۔فیضؔ صاحب وہاں ٹورونٹو میں گذشتہ دس سال سے آپ کے دوست پروفیسر عزیز احمد صاحب علم وادب کی شمع جلائے ہوئے ہیں اور پروفیسر حفظ الکبیر قریشی صاحب نے ان کی سرپرستی میں ''انجمنِ اردو کینیڈا'' قائم کی ہوئی ہے جس کے زیرِ انتظام ماہانہ ادبی نشستوں کے ساتھ ساتھ ہندو پاک مشاعروں اور کانفرنسوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔قریشی صاحب نے مجھے اپنی انجمن کا اعزازی سیکریٹری بھی بنایا ہوا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب آپ یہاں مستقل قیام کے لیے آ جائیں گے اور عملی طور پر ہمارے ادارے کو وقت دیں گے تو یہ ذمہ داری باقاعدہ طور پر آپ کو سونپ دی جائے گی۔

فیضؔ صاحب کہنے لگے: بھئی یہ تو اچھا ہو جائے گا۔آپ جیسے فعال اور باصلاحیت نوجوانوں کو وہاں ضرور جانا چاہیئے۔اس طرح ہمارا وہاں بھی ایک ٹھکانہ ہو جائے گا۔

ہم نے عرض کیا۔خیر ابھی تو نہیں جب ہمارے بچے سمجھدار ہو جائیں گے تو عصری تقاضوں کے تحت،ان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہم ضرور کینیڈا جا بسیں گے۔تب ہی ہم نے انہیں بتایا کہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو جانے کے سبب اِن دنوں عزیز احمد صاحب کی صحت بالکل جواب دے چکی ہے۔یہ بات سن کر فیضؔ صاحب فکرمند ہو گئے اور دیر تک ان کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔

اس بات کا ہمیں ہمیشہ ملال رہے گا کہ فیضؔ صاحب کی زندگی میں ہم مستقل قیام کے لیے کینیڈا نہ آ پائے اور اُن کی خواہش کے مطابق یہاں اپنے گھر کو ان کا ''ایک اور ٹھکانہ'' بنانے سے محروم رہ گئے۔ہمیں رشک آتا ہے،کراچی کی آمنہ مجید ملک پر،اسلام آباد کی سرفراز اقبال پر، لاہور میں ندرت الطاف پر،ملتان میں عفت ذکی پر اور لندن کی زہرہ نگاہ پر کہ جن کے آشیانے فیضؔ صاحب کا ٹھکانہ ہُوا کرتے تھے۔یا حسرتی!

ان ہی دنوں فیض صاحب نے بتایا کہ دہلی سے کملیشور صاحب کا خط اور اندر گجرال صاحب کے حوالے سے بھیشم ساہنی صاحب کا تار ملا ہے۔ کچھ ڈی سی ایم مشاعرہ کا سلسلہ بھی ہے۔ اپنے، اردو، فارسی ادب کے تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے چند روز کے لیے ویسے بھی ایک بار پھر دہلی جا رہے ہیں، جہاں سے واپسی پر ماسکو ہوتے ہوئے، بیروت لوٹ آئیں گے۔ لیکن دہلی پہنچنے پر انہیں، اُن کے لاہور کے پتے پر ٹورانٹو سے بھیجا ہوا دعوت نامہ ملا۔ وہ ماسکو سے بیروت آنے کی بجائے ٹورانٹو چلے گئے۔

ہم دیکھتے تھے کہ فیض صاحب، جب کسی ملک کا دورہ کر کے واپس آتے تھے تو قدرے تازہ دم ہوا کرتے تھے۔ اس مرتبہ ان کے کینیڈا اور امریکہ کے دورے سے واپسی پر ہمیں ان میں وہ تازہ دمی نظر نہ آئی۔ آزردگی زیادہ نظر آتی تھی۔

آخر ایک دن باتوں کے دوران ہم نے پوچھا: فیض صاحب! کیا بات ہے۔ ان دنوں آپ کچھ زیادہ ہی پریشان لگتے ہیں؟

کہنے لگے Camp David کا معاہدہ ہوئے کتنے مہینے ہو گئے ہیں لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ یاسر عرفات بہت پریشان ہیں، ان کی کچھ چلتی نہیں ہے۔ فلسطین کے نہتے عوام پر اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں میں شدت آ گئی ہے۔ جیسا کہ یہاں آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ کی شہ پر اب اسرائیل کے بمبار طیارے لبنان کی سرحدوں کو پھلانگ کر بیروت تک پر ایک آدھ بم گرا جاتے ہیں۔ میں فلسطین کے مستقبل سے بہت مایوس ہو چکا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ تیس چالیس سال تک بھی ایک آزاد فلسطین ریاست قائم ہو پائے گی۔ تمام مغربی دنیا کی ہمدردیاں صرف اسرائیل کے ساتھ ہیں۔

ہم نے فیض صاحب سے پوچھا: اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

کہنے لگے: کاش اب بھی عرب ممالک عقل کے ناخن لیں اور سوویت یونین سے اپنے تعلقات استوار کریں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں، صرف سوویت یونین ہی ایک ایسی سپر پاور ہے جو دولت مند عربوں کو تحفظ اور فلسطینیوں کو ایک آزاد ریاست دلوا سکتی ہے۔ اس ضمن میں، ہم نے یاسر عرفات صاحب سے بھی بات کی تھی لیکن وہ کہتے ہیں کہ عرب کسی

لادین قوم و ملک سے تعلقات قائم کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔

قیامِ بیروت کے دوران فیضؔ صاحب کو دنیا میں آنے والے تغیرات کا احساس شدّت اختیار کر رہا تھا۔ انہیں اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے نظریاتی نصب العین کی بنیاد اتنی مضبوط نہیں ہے، جتنی ابھی حال ہی میں معلوم ہوتی تھی۔ بے شک ان کے لیے یہ ایک بڑا المیہ تھا۔ ان کی شاعرانہ حس کو پیغمبرانہ بصیرت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ فیضؔ نے تو ان واقعات کی گویا پیش بینی کی تھی جن کا خیال اُس زمانے میں کسی سوویت کو خواب میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ فیضؔ کی بصیرت اور ان کے تشویشناک احساسات، ان کے اشعار کے کبھی سوالیہ اور کبھی شک و شبہ کے لہجے میں اور کبھی المیائی کیفیت میں ظاہر ہوئے۔ فیضؔ کے آخری دور کے کلام کا رنگ ایسا گہرا انفرادی رنگ ہے، جو خود ان کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ اُن ہی دنوں فیضؔ صاحب نے ایک نظم "پھول مرجھا گئے ہیں سارے" کہی تھی:

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں ہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نور ہو گئی ہیں
آئینے چور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بجھ کے سو گئی ہیں
اور ان بادلوں کے پیچھے
دور اس رات کا دلارا
درد کا ستارا
ٹمٹما رہا ہے
مسکرا رہا ہے

اور یہی وہ موڑ ہے کہ جہاں سے ایک راستہ مصالحت کی طرف اور دوسرا احتجاج کی طرف جاتا ہے۔ ہمارا شاعر مصالحت کو نیک عمل نہیں جانتا کہ ایسے میں وہ اپنے آپ اور اپنے لوگوں سے غدّاری کا مرتکب ہوگا۔ وہ احتجاجی روّیے اختیار کرتا ہے ظلم کے خلاف، ان لوگوں کے خلاف جو

معاشرے کے سارے کے سارے کاروبار کو اپنے اندازے سے چلانا چاہتے ہیں، جو ملک کی تمام صنعتوں پر قابض ہیں، جو کوٹھیوں، کاروں کی طرح انسانی جسم بھی اپنی قوتِ خرید میں رکھتے ہیں۔ اور اپنی مرضی سے انسانی محنت کے معاوضے کا تعین کرتے ہیں۔ حکومتیں ان کی ہیں، قانون میں ترامیم کرنے کا حق انہیں حاصل ہے، علم کی روشنی ان کی قید میں ہے۔ انہوں نے تمام اصول، تمام قوانین اور تمام عقائد اپنی مرضی سے متعین کیے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ سبھی ان پر عمل پیرا ہوں۔ شاعر ان تمام احکامات، قوانین اور معاشرے کے اس تشکیل کردہ نظامِ حیات کو اپنے ذہن کے مطابق نہیں پاتا، تو ان استحصالی قوتوں سے نبردآزمائی کی جسارت کرتا ہے۔ ان شخصیتوں کی نشان دہی کرتا ہے جو معاشرے میں تبدیلیوں کے خلاف ہیں کہ اس ردوبدل سے ان کے بنائے ہوئے اصول اور نافذ کردہ احکامات کی عمارت پل بھر میں زمیں بوس ہو جائے گی۔ شاعر کے ان نظریات سے ان کو کوئی تعرض نہیں ہو سکتا، اگر ادیب و شاعر اپنی آزادیٔ فکر ان کے قول و فعل تک محدود رکھیں یا پھر وہ غیر جانب دار رہیں۔ سب کچھ دیکھتے جائیں اور کچھ نہ کہیں لیکن اگر وہی شاعر اس نظام کو بدلنے اور اس کی جگہ ایک متوازن معاشرے کا مطالبہ کر بیٹھیں تو پھر ان کی یہ سوچ، ان کا یہ اندازِ فکر اور ذہن کی رسائی ان مقتدر شخصیتوں کو ناگوار گزرے گی کہ ان کی نازک طبیعتیں تو وہ بات بھی ناگوار محسوس کرتی ہیں جس کا ذکر سارے فسانے میں نہ تھا۔ وہ ان باتوں کو کیوں کر نظر انداز کر سکیں گے جن کی نشان دہی برسرِ عام ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ خود شاعر کس ذہنی سطح پر ہے، اگر وہ ان مقتدر شخصیتوں کو خود سے قریب تر پاتا ہے، اسے اس نظام اور اس نظام کو تشکیل دینے والے افراد سے کوئی گلہ نہیں ہے، وہ ان سے متفق ہے کہ عوام کو سیدھا رکھنے کے لیے یہ تمام پابندیاں ضروری ہیں، تو وہ خود کو محصور نہیں پاتا، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کھلی فضاء میں سانس لے رہا ہے، اس پر کوئی بے جا پابندی نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس نظامِ حیات کو ناپسند کرتا ہے، اس میں تبدیلی لانا چاہتا ہے، لیکن اختیارات نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتا اور اگر کرنا ہی چاہے تو خود کو پابند پاتا ہے۔ ذاتی طور پر اسے یہ زیست گوارا نہیں۔ وہ اس کے خلاف لکھنا چاہتا ہے۔ جاگیردار طبقے اور حکمراں جماعت کی ہاں میں ہاں ملانا، اس کے نزدیک کفر کا درجہ رکھتا ہے، جب کہ با اختیار طبقہ اپنی ہر بات کو حکم کا اور ہر حکم کو قانون کا درجہ دیتا ہے۔ نتیجتاً شاعری کی حق

گوئی انہیں اشتعال دلاسکتی ہے۔ادہر شاعر حق گوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔۰۰اس دنیا میں چہار جانب پھیلی ہوئی سچائیوں کے انتظار میں ہے۔محبت و چاہت کا متلاشی ہے۔وہ جب ستم۰ ناانصافی کے خلاف بات کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ اس کا دل دکھتا ہے ان حالات پر۔انسان کو انسان پر ظلم کرتے دیکھتا ہے تو اس پر نوحہ کناں ہوتا ہے۔اس کے نوحے کبھی تو کرب انگیز لہجہ اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی انقلابی اور فیضؔ کی تمام شاعری اس کی زندہ مثال ہے۔

فیضؔ کی شاعری حسن و صداقت کی تلاش کا نام ہے۔وہ ظلم و ناانصافی، غلامی و انسانی عدم مساوات، محنت کشوں کے استحصال اور سامراجی قوتوں کے مظالم کے خلاف اس لیے تھے کہ یہ تمام عناصر زندگی کا حسن مٹانے اور اسے بدصورت بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔انہی منفی رجحانات سے حسن و صداقت کی اقدار مجروح ہوتی ہیں۔جب کہ فیضؔ اس معاشرے کے لیے ایک مثبت انقلاب کے خواہاں تھے۔فیضؔ کے ان انقلابی خیالات نے کبھی گھن گرج کی شکل اختیار نہیں کی، بلکہ بڑے نرم، ملائم انداز میں وہ ایک بڑی اور کڑوی بات کہہ جاتے تھے۔زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ذائقہ ان کے اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے، کہ جہاں مزدور و کسان دن بھر کی محنت اور لہلہاتی فصلوں کے باوجود اپنے کھیتوں، کھلیانوں سے اپنے لیے صرف بھوک ہی حاصل کرپاتے ہیں کہ ان کی ساری محنت وڈیروں کی تجوریوں میں بند ہونے کے لیے ہی ہے۔دراصل فیضؔ کی شاعری اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں۔فیضؔ نے اپنی غزلوں، نظموں کو اپنے عہد کے حالات سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔فیضؔ کی سامراج سے نفرت ان کے اشعار سے عیاں ہے۔ سرمایہ داری و جاگیرداری، غلامی و محکومی، چند انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کی پامالی اور سفاکانہ استحصال اور جبر و ظلم سے نفرت فیضؔ کی شاعری کا مطمحِ نظر ہے۔جہاں اتنی ساری نفرتیں اکھٹی ہوں وہاں سوائے تلخی، غصے، گھن گرج اور چیخوں کے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ان تمام نفرتوں پر چوں کہ فیضؔ کی محبت غالب آ گئی ہے۔بنی نوع انسان سے محبت۔اس لیے ان کی شاعری میں ان منفی عناصر کی نشان دہی کے وقت بھی کہیں شور، ہنگامہ نہیں ہوتا کہ فیضؔ کی شاعری لفظوں میں نہیں، اثرات میں، اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔چنانچہ فیضؔ کے ہونٹوں سے نکلی سرگوشی سننے والے کے باطن میں میں قیامت برپا کر دیتی ہے۔فیضؔ ایک معاملہ فہم، حالات کا صحیح تجزیہ کرنے والے

انسان تھے۔ ان کا ایک واضح نقطۂ نظر اور اندازِ فکر تھا۔ اس اندازِ فکر کو انہوں نے اپنے شعروں میں بیان کیا ہے۔ وہ معتوب ٹھہرے، باغی کہلائے، انقلابی ذہنیت نے انہیں کبھی اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کی ترغیب نہ دی۔

اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد فیضؔ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو آفاقیت کی حدوں کو پار کر گئے ہیں۔ بہت سے نقادوں نے غالبؔ اور اقبالؔ سے فیضؔ کی فکری مماثلتوں کے حوالے سے تقابلی مطالعے کیے ہیں اور کئی درست نتائج بھی نکالے ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ غالبؔ اور اقبالؔ کے مقابلے میں فیضؔ کا ایک الگ شعری اور فکری نظام ہے۔ ان کا اپنا، زبان، اسلوب اور صوتیاتی و نظریاتی مکتبِ فکر ہے جس کا اظہار خود انہوں نے میرے سامنے بارہا کیا ہے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر، حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اُس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ شعر و فن اور حیاتِ انسانی پر اس کے اطلاق کے سلسلے میں فیضؔ صاحب کی یہ وضاحت، ان کی شاعری کے مطالعے اور اس کے مندرجات کو سمجھنے میں سہولت پیدا کرتی ہے۔

دورانِ گفتگو اُسی لمحے ہمارے ذہن میں ایک خیال اُبھرا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں فیضؔ صاحب سے ان کی زبان زدِ عام شاعری کی مقبول ترین اور خود ان کو بہت زیادہ پسند نظموں اور غزلوں کے حوالے سے ان کی رائے معلوم کر لی جائے۔

جب ان سے پوچھا تو کہنے لگے: بھئی جہاں تک نظموں کا تعلق ہے تو جب 1941 میں ہمارا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' شائع ہوا تو اُس کی چھ سات نظمیں بیحد مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد 1952 میں ''دستِ صبا'' 1956 میں ''زنداں نامہ'' 1965 میں ''دستِ تہِ سنگ'' 1971 میں ''سرِ وادیٔ سینا'' اور اب 1978 میں ''شامِ شہرِ یاراں'' کا سب ہی کلام پسند کیا گیا اور ہمیں بھی اطمینان بخشتا ہے۔

''مرے دل مرے مسافر'' کی تمام شاعری، غریب الوطنی، تنہائی اور فیضؔ صاحب کی فکری

شکست و ریخت کی تصویر ہے، جس کے وجود میں آتے ہی ہم فیض صاحب کے منہ سے سن چکے تھے اور اپنے پاس نوٹ بھی کرتے رہنے کے معتقدانہ عمل کے طفیل بار بار پڑھتے بھی رہتے تھے ۔ بیروت کی اُن ہی ملاقاتوں کی مناسبت اور یادداشتوں میں اُس عرصے کا بیشتر کلام ہم اس کتاب میں جگہ جگہ درج بھی کرتے آرہے ہیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ''مرے دل مرے مسافر'' کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آ چکی تھی اور اُن دنوں فیض صاحب لندن (انگلینڈ) میں مقیم تھے اور اکثر ''اردو مرکز'' میں افتخار عارف صاحب کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اُن ہی دنوں جب ہمارے دوسرے شعری مجموعے ''دستاویز'' کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو ہم ایک ''ویک اینڈ'' پر جدہ سے لندن گئے اور فیض صاحب سے درخواست کی کہ ''دستاویز'' کے لیے ابھی کچھ لکھ دیجئے۔

کہنے لگے: ''اس وقت تو ہم ''مہر دو نیم'' (افتخار عارف کا پہلا شعری مجموعہ) کے لیے لکھ رہے ہیں۔''

ہم نے عرض کیا: ہماری کتاب پریس جانے کے لیے تیار ہے۔ فی الحال فلیپ کے لیے ہی چند لائنیں لکھ دیجئے۔ فیض صاحب نے اپنا رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور لکھا:

''تسلیم الٰہی زلفی کی شاعری ان کے عہد کی نمائندہ شاعری ہے لیکن لب ولہجہ یہ وہی اختیار کرتے ہیں جو ان کی مجلسی گفتگو کا ہوتا ہے، اسی لیے ان کا ہر شعر انفرادیت لیے ہوتا ہے۔ لفظوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں، لیکن اپنے گرد و پیش پر ان کی نظر گہری ہے۔ اب بھلا ایسے تازہ دم شاعر سے، اس کے مستقبل میں کیا کچھ توقع نہیں رکھی جاسکتی''۔ (اقتباس)

ایک دن، ہم فیض صاحب کو ''الحمراء'' کی کافی پلانے لے جارہے تھے۔ ہماری کار میں لبنان کی مشہور اور مقبول ترین مغنیہ فیروز کی کیسیٹ بج رہی تھی۔ فیض صاحب اُس کی آواز کو غور سے سنتے رہے۔

کہنے لگے: بھئی ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے اپنی ناہید نیازی کوئی عربی گانا گارہی ہیں۔

ہم نے عرض کیا: جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا۔ فیروز کی آواز ناہید نیازی سے بہت ملتی ہے۔

جب فیروز نے محمود درویش کا لکھا اپنا مشہور نغمہ گایا:

لا جلكى يا مدينة السلام

يا قدس يا مدينة السلام

لم يقفل باب مدينتنا

انا ذاهبه لاصلی

افتح الابواب

القدس لنا

البيت لنا

للقدسْ سلام

للقدسْ سلام ۔۔

(تیرے لیے اے سلامتی کے شہر قدسؔ! تیرے لیے۔ اے ظالمو! ہم پر اِس شہر کے دروازے بند نہ کرو۔ دروازے کھولو کہ میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں)

بیت المقدس کے لیے فیروزؔ نے یہ نغمہ اتنے جوش، جذبے اور ولولے سے گایا ہے کہ اسے سن کر فیضؔ صاحب پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی۔

کہنے لگے: زلفی اسے پھر لگائیں۔ کیسیٹ Rewind کی اور محمود درویش کا وہی پر جوش نغمہ ایک بار پھر ہماری روحوں کو بالیدہ کرنے لگا۔

اُس کے بعد جب جب فیضؔ صاحب ہماری گاڑی میں بیٹھے ہر بار فیروزؔ ہی کی کیسیٹ بجانے کی خواہش کا اظہار فرمایا فیروزؔ کے دیگر اغنیات کو سن کر بھی وہ اس کی آواز کی نرمی اور مٹھاس سے بیحد محظوظ ہوتے تھے۔

فیضؔ صاحب کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہم نے انہیں بتایا کہ اگلے اتوار کو فیروزؔ کا کنسرٹ ہے اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو لے چلیں۔

کہنے لگے: بھئی ضرور۔ ہم تو دل و جان سے جائیں گے۔

ہم انہیں فیروزؔ کے کنسرٹ میں لے گئے۔ دو گھنٹے کے اس کنسرٹ کو فیضؔ صاحب نے اتنی دلچسپی اور توجہ سے سنا کہ ہم بھی نہال ہو گئے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ فیروزؔ نے گانے کا آغاز ہی یـــا قـدس یـا مـدینة السلام سے کیا۔ چونکہ اُن دنوں فلسطینیوں پر اسرائیل کی چیرہ دستیاں اپنے عروج پر تھیں۔ بیت المقدس میں فلسطینیوں کا داخلہ تقریباً بند تھا اس لیے فیروزؔ کا یہ نغمہ سن کر پورا ہال پُر

جوش نعرے لگا تا رہا جس میں وہاں کے عیسائی لبنانی بھی شامل تھے۔اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ جس طرح، یہودی مسلمانوں کو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور وہاں عبادت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔اسی طرح عیسائیوں کے داخلے، زیارت اور عبادت کرنے پر بد کتے تھے۔فیروز کے اس پُر جوش نغمے یا قدس یا مدینة السلام کو سن کران پر بھی وہی اثر ہوا جو بیروت کے مسلمانوں پر۔

ایک طرف تو بیروت کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے، دوسرے بیگم فیض کو اپنا گھر، دونوں بیٹیاں اور نواسے، نواسیاں بہت یاد آ رہے تھے۔فیض صاحب نے ان سے کہا کہ مناسب ہے کہ اب آپ پاکستان چلی جائیں۔اتفاق سے ان ہی دنوں ہمارا بھی اپنی سعودی ائر لائنز کی کسی Aircraft GSE Maintenance میٹنگ کے سلسلے میں جدہ سے بیروت جانا ہوا۔ ہمیں دیکھ کر بیگم فیض بہت خوش ہوئیں۔

کہنے لگیں: فیض مجھے پاکستان بھیج رہے ہیں لیکن میں نے بھی ان سے کہہ دیا ہے کہ میں آپ کو زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کا وقت دے رہی ہوں کہ آپ اپنے سارے کام نپٹا کر گھر واپس آ جائیں۔زلّی! آپ تو دیکھتے ہیں کہ یہاں بیروت میں ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔کوئی مددگار نہیں ہے۔کوئی ملنے جلنے والا نہیں ہے۔ایک بھی ایسا نہیں ہے جو فیض کی "بے بی سٹنگ" کر سکے۔مجھے بچوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ان کا ذہن تو ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ان دنوں ان کی خود فراموشی اپنے عروج پر ہے اگر میں وقت پر ان کے آگے کھانا نہ رکھوں تو یہ محض سگریٹ اور شراب پر ہی شاکر رہیں گے۔اپنے منہ سے کبھی نہیں کہیں گے کہ مجھے بھوک لگی ہے۔جب میں یاد دلاتی ہوں کہ آپ کچھ کھا لیجئے۔تو کہتے ہیں۔اچھا دے دو۔

ہمارا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اور فن کار دنیا زمانے سے نرالے ہوتے ہیں، لیکن وہ دوسروں سے اس لیے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کا مشغلہ خالص ذہنی ہوتا ہے اور ان کی عرق ریزی اور جگر کاری کا نتیجہ ہر کس و ناکس کے لیے نہیں ہوتا اور اس سے ہر شخص محظوظ نہیں ہو سکتا لیکن ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی ذمہ داری دراصل ہمارے معاشرے پر ہے جو ایسے حالات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن میں ہر شخص شاعری یا مصوری سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، لیکن فن کار یا شاعر کی ذات سے نہیں۔فنکار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے، اس لیے وہ اس دنیا کی حدود سے نکل

جاتا ہے۔اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اپنے گھربار اور روزمرّہ کی ضرورتوں کی پروانہیں رہتی۔اسے ایسے رفقاء کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کرسکیں۔یہ ہفت خواں منازل اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہوجائیں تو شاعر، مصوّر یا مصنّف اپنی دنیا میں کھو سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کارِ دنیا تمام ہوچکے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مصنّفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں، کیونکہ وہ نہ ہوتے تو ان کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی! ان تمام دھڑکوں کے ساتھ آخرالیس پاکستان چلی گئیں۔

ایفروایشیائی مصنّفین کی تحریک جس کی باگ ڈور اور تحریک کے اخراجات ماسکو کے ہاتھ میں تھے لیکن ایک وقت آیا جب ان میں کافی گڑبڑ ہونے لگی۔ نتیجتاً تحریک بے قابو ہونے لگی۔نو آزاد ممالک کے قومی اغراض و مقاصد ماسکو کے نظریات سے ٹکرانے لگے جو ماسکو کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ ادھر فیضؔ جو فطرتاً امن پسند انسان تھے، ان پر ان بحثوں، جھگڑوں اور تنازعات کا بہت برا اثر پڑتا تھا۔ وہ سوویت نظام کی نوکرشاہانہ دیوارں سے ٹکرانے لگے کیونکہ وہ سوویتی حکمرانہ طور طریقوں، اس کی بد اطواری، رشوت ستانی وغیرہ کو زیادہ قریب سے دیکھ رہے تھے۔اب مزید صرفِ نظر نہیں کرسکتے تھے۔ہم دیکھتے ہیں کہ اس تمام صورتِ حال کا مبہم سا عکس فیضؔ کی اشعار کے تشویشناک لہجے اور الیاتی رنگ میں جھلکتا ہے۔آج اس کی وجہ سب پہ واضح ہے کہ سویت یونین کے ٹوٹ جانے کے ساتھ ہی ایفروایشیائی مصنّفین کی تحریک اور اس انجمن کا ترجمان رسالہ ''لوٹس'' سب اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک فیضؔ بیروت میں اُس وقت تک رہے کہ جب تک بیروت نہیں اجڑا حتیٰ کہ وہ بلڈنگ جس میں فیضؔ صاب رہتے تھے، بمباری سے تباہ نہیں ہوگئی۔۱۹۸۲ء کے زمانے میں، جب ہم مہینے میں ایک بار ضرور فیضؔ صاحب سے ملنے جدّہ سے بیروت جایا کرتے تھے۔یہ وہ وقت تھا کہ بیگم فیضؔ بیروت سے اپنے بچّوں کے پاس پاکستان جاچکی تھیں لیکن ہم دیکھتے تھے کہ جیسے تمام سکون اور اطمینان فیضؔ صاحب کے جسم و ذہن میں سمٹ آیا ہے۔وہ اپنے اندر کی ہیجان خیزی اور طلاطم کو کبھی اپنے چہرے پر نہیں لاتے تھے۔تب ہم پریشان ہوکر اُن سے کہتے۔

فیضؔ صاحب! اب آپ کو بھی بیروت سے نکل جانا چاہیئے۔ اُدھر کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آپ کا تقرر بھی ہو چکا ہے۔ آپ وہیں کیوں نہیں چلے جاتے۔

کہنے لگے: نہیں بھئی۔ ہم نے جیوتی باسو صاحب اور وائس چانسلر صاحب سے معذرت کر لی ہے۔ بس اب تو چند مہینوں میں یہاں کی ذمّے داریوں کو نپٹا کر اپنی بیگم کی طرح ہم نے بھی اپنے گھر جانا طے کر لیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال، میزو (منیرہ ہاشمی) چھیمی (سلیمہ ہاشمی) اور ان کے بچّوں کے درمیان گذارنا چاہتے ہیں۔

فیضؔ صاحب جب تک سیاسی قیدی رہے، زنداں کی دیواروں کے پیچھے وطن کی محبت کے گیت گاتے رہے۔ چمن میں رہے تو چمن کی خیر مانگتے رہے۔ جب جلاوطن ہوئے تو وطن واپس لوٹنے کی تمنا کو صلیب کی طرح اپنے کاندھے پر اٹھائے اپنے ''مسافر دل'' کی ہمراہی میں ملکوں ملکوں سفر کرتے رہے۔ اور آخر کار۔ مادرِ وطن کی کشش۔ انہیں پاکستان واپس لائی لیکن شاید یہ مٹی کا بلاوا تھا جس نے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ ان کے ہم وطن ان کی تربت پر آنسو بہانے بیروت کیسے جا سکتے تھے۔

Faiz Ahmed Faiz in Beirut

Reminiscence of

Tasleem Elahi Zulfi

ISBN:978-969-472-264-1